اسلام اور جدید سائنس
مولانا محمد شہاب الدین ندوی

اسلام اور جدید سائنس

(نیا اور ضخیم ایڈیشن)

عصرِ جدید میں قرآنِ حکیم کی اعجازی
رہنمائی کا ایک اچھوتا اور لازوال مرقع

از

مولانا محمد شہاب الدین ندوی

مکتبہ تعمیر انسانیت

اُردو بازار لاہور ۲

ضابطہ

جملہ حقوق محفوظ

طابع ———— محمد سعید اللہ صدیق بن شیخ محمد قمر الدین مرحوم

ناشر ———— مکتبہ تعمیرِ انسانیت، لاہور

مطبع ———— زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور

طبع ———— سنہ ۱۹۹۳ء

تعداد ———— ایک ہزار

قیمت ———— ۱۲/- روپے

انتساب

قرآنِ حکیم کے نام جو حکمت و دانائی اور لازوال سچائیوں سے بھرپور دنیا کا عظیم ترین صحیفہ ہونے کے باوجود ایک مظلوم ترین کتاب بھی ہے۔ کیونکہ خود اپنوں کی ناقدری کے باعث اس کے لعل و جواہر کو خزف ریزے سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

وہ کتابِ حکمت جو ہر دور میں اہلِ اسلام کو زندگی کے حقائق سمجھانے کے لئے نازل کی گئی تھی اُس کو ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر اور طاقوں کی زینت بنا کر غیروں سے نظریات کی بھیک مانگی جا رہی ہے۔ اس کو انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ اور مسلمانوں کی حرماں نصیبی نہ کہا جائے تو پھر کیا کہا جائے!

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُوْراً :

اور (قیامت کے دن) رسول کہے گا کہ اے میرے رب میری قوم نے اس قرآن کو نظر انداز کر رکھا تھا۔

فہرستِ مضامین

۲۔ اسلام اور جدید سائنس

مقصد اور طریقۂ کار

۳- قرآن اور سائنس
چند اصول و کلیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرف اول

قرآن حکیم کے اسرار و عجائب کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک ایسا بحر بے کراں ہے جس میں جتنا زیادہ غور کیا جائے اتنی ہی شدت کے ساتھ اس کے حقائق و معارف اُجاگر ہوتے ہیں۔ وہ ہر دور کے لئے خدائے رحمان کی جانب سے نامۂ ہدایت ہے، جو عصری تقاضوں کے مطابق انسان کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتا ہے، چاہے زمانہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلے۔ اس اعتبار سے وہ یقیناً صحیفۂ خداوندی قرار پاتا ہے، جو ابدی سچائیوں سے بھرپور ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی انسان سیکڑوں ہزاروں سال قبل کوئی ایسا جامع و مانع کلام وضع نہیں کرسکتا جو مابعد کے تمام ادوار میں بغیر کسی ترمیم و اضافے کے نوعِ انسانی کی صحیح صحیح اور مکمل طور پر رہنمائی کرنے والا ہو۔ اور پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عصرِ حاضر میں سوائے اسلام کے کوئی بھی دوسرا مذہب ایسا موجود نہیں ہے جو موجودہ سائنسی ایجادات و اکتشافات کے پیش نظر نوعِ انسانی کی حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس حیثیت سے یقیناً وہ ایک معجزہ ہے جو نوعِ انسانی کو مبہوت و ششدر کر دینے والا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ آج مذہب کو الحاد و لادینیت کی جانب سے جو زبردست چیلنج درپیش ہے اس کا مقابلہ سوائے اسلام کے کوئی دوسرا مذہب نہیں کرسکتا۔ اس اعتبار سے آج روئے زمین پر زندگی کے میدان میں وہ تن تنہا نظر آتا ہے۔ اور مختلف قسم کے فلسفوں اور "ازموں" کی طوفانی موجیں آتی ہیں اور اُس کے مضبوط و مستحکم قلعے سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ پچھلی صدیوں میں ایسی کتنی ہی تحریکیں رونما ہوئیں، کتنے ہی فلسفے اور مکاتبِ فکر بنے اور بگڑے اور کتنے ہی نظریات کو

عروج و زوال سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر رسمی علوم سے ناواقف ایک "اُمّی" کا پیش کیا ہوا دینِ متین کبھی انتشار و اضطراب کا شکار نہ ہو سکا۔ بلکہ وہ تمام خود ساختہ نظریات و تخیلات، گمراہ مذاہب اور ہر قسم کے فلسفوں اور تحریکوں کو چودہ سو سال سے علمی و عقلی طور پر برابر شکست پر شکست دیئے چلا جا رہا ہے اور ہر ایک کو میدانِ مبارزت میں پچھاڑتا دکھائی دے رہا ہے۔ کیا یہ اسلام کے دینِ برحق ہونے کی معجزانہ اور حیرت انگیز دلیل نہیں ہے؟ کسی مذہب کے آسمانی ہونے کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس اعتبار سے قرآنِ حکیم یقیناً کلامِ الٰہی ہے، جو قیامت تک ہر دور کی رہنمائی کے لئے نازل ہوا ہے۔ اگر وہ کسی مخصوص دور کے لئے نازل ہوا ہوتا تو اس میں عصرِ جدید کی رہنمائی کرنے اور اُس کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کی سکت بالکل نہ ہوتی۔ لہٰذا آج کی صحبت میں یہی دکھانا مقصود ہے کہ وہ موجودہ دور کے مادّہ پرستانہ چیلنج کا مقابلہ کس طرح کرتا ہے اور موجودہ ایجادات و اکتشافات کے دَور میں انسان کی رہنمائی کس انداز میں کر سکتا ہے؟

پیشِ نظر کتاب چار مقالات کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں لکھے گئے ہیں۔ اس لئے ہو سکتا ہے کہ ان میں منطقی ربط کی کچھ کمی نظر آئے، مگر پھر بھی شروع کے تین مقالات ایک حد تک مربوط ہیں۔ پہلے مقالے "خلافتِ ارض کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی کی اہمیت" میں یہ دکھایا گیا ہے کہ موجودہ سائنسی دور میں قرآنِ حکیم اپنے پیروؤں کو کیا ہدایات دیتا ہے اور وہ جدید سائنسی علوم کو کس نظر سے دیکھتا ہے، جس کے باعث اس کے پیرو موجودہ چیلنج سے عہدہ برآ ہو سکیں؟ یہ مقالہ ماہنامہ "فکر و نظر" اسلام آباد (پاکستان) کے جنوری اور فروری ۱۹۸۱ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا، جس میں اب کافی ترمیم کر دی گئی ہے۔

دوسرے مقالے "اسلام اور جدید سائنس: مقصد اور طریقۂ کار" میں اسلام اور سائنس کے باہمی ربط و تعلق اور ان دونوں کی ہمنوائی کے اظہار میں چند بنیادی نکات پیش کئے گئے ہیں، جن کے ملاحظہ سے اسلامی عقائد و نظریات کی برتری اور جدید سائنس کی تصدیق و تائید کی از کی داستان سامنے آتی ہے۔ یہ مقالہ "دی اسلامک سوسائٹی آف انڈیا" مدراس کی جانب سے منعقدہ

22302

حرفِ اوّل

ایک مجلسِ مذاکرہ (سمینار) میں ۱۲؍مئی ۱۹۷۰ء کو سنایا گیا تھا۔ بعد میں یہ مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے جولائی ۱۹۷۰ء کے شمارے میں شائع ہُوا۔ پھر اس کو فرقانیہ اکیڈمی کی جانب سے ایک کتابچے کی شکل میں بھی شائع کیا گیا تھا جو عرصہ ہُوا ختم ہو چکا ہے۔ لہٰذا اب اس کو دوبارہ اس مجموعہ میں شامل کرنا مناسب سمجھا گیا۔

تیسرا مقالہ " قرآن اور سائنس : چند اُصول و کلّیات " دراصل بعض اعتراضات کے جواب میں لکھا گیا تھا، جس میں قرآن اور سائنس کے تعلق سے پیدا ہونے والے بعض شکوک و شبہات اور غلط فہمیوں کو دُور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ اس سلسلے میں اسلام کے مقاصد اور اُس کی دعوت کے طریقۂ کار کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ یہ مقالہ فرقانیہ اکیڈمی کے ترجمان سہ ماہی " ندائے فرقان " کے پہلے شمارے میں شائع ہُوا تھا۔

اس اعتبار سے یہ تینوں مقالے بہت بڑی حد تک مربوط ہیں۔ اور آخری مقالہ ذرا جُداگانہ نوعیت کا ہے، جس کے ذریعہ کائنات کے بعض اسرارِ سربستہ کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ مگر اس سلسلے میں ایک حقیقت یہ ہے کہ جدید سائنس اب تک اس باب میں کسی قطعی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی ہے کہ ہماری زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر بھی زندگی کا وجود ہے یا نہیں ؟ جب کہ قرآن میں بعض اشارات و کنایات کے روپ میں اعلان کیا گیا ہے کہ ہمارا کرۂ ارض ہی اس سلسلے میں واحد سیارہ نہیں ہے بلکہ ایسے اور بھی اجرام ہیں جہاں پر " زندگی " سے بھرپور سرگرمیاں جاری ہیں۔ یہ مقالہ " ندائے فرقان " کے دوسرے شمارے میں شائع ہُوا تھا۔

غرض اس اعتبار سے اس مجموعہ میں اُن قرآنی حقائق و معارف سے بحث کی گئی ہے جن کے ذریعہ عصرِ جدید میں قرآن حکیم کی اعجازی رہنمائی سامنے آتی ہے۔ اس لئے یہ مقالات بہت زیادہ پسند کئے گئے۔ بلکہ علمی حلقوں میں نہایت درجہ گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا گیا۔ اس لئے انھیں ایک مجموعے کی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا گیا تاکہ ان کی افادیت عام ہو سکے۔

[illegible] ہوئے

قرآن حکیم کے تحقیقی مطالعے میں مصروف رہا ہے۔ لہٰذا اس سلسلے میں جو کچھ نتائج بندے نے اخذ کئے ہیں، وہ پوری ایمانداری کے ساتھ پیش کر دئیے ہیں۔ اور ان موضوعات پر مزید کئی تصانیف زیرِ تکمیل ہیں جو انشاءاللہ یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آئیں گی۔ اور اس سلسلے میں بندہ کا بنیادی مقصد دینِ اسلام کی ابدیت کا اثبات اور الحاد و مادیت کی تردید ہے، جو وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے، جیسا کہ اہلِ علم پر مخفی نہیں ہے۔ بہرحال اگر کسی صاحبِ علم کو راقمِ سطور کے اخذ کردہ کسی نتیجے سے اختلاف ہو تو براہِ کرم وہ پورے دلائل کے ساتھ راقمِ سطور کو آگاہ کرے تاکہ میں اس سلسلے میں دوبارہ غور کر سکوں۔ کیونکہ کوئی بھی انسان غلطی سے پاک قرار نہیں دیا جا سکتا۔

خادمِ قرآن

محمد شہاب الدین ندوی

اتوار ۱۷/۵/۱۴۰۷ھ

۱۸/۱/۱۹۸۷ء

۱۔ خلافتِ ارض کے لئے سائنس اور ٹیکنالوجی کی اہمیت

اسلام اور علومِ جدیدہ

قرآن مجید بلاشبہ ہمارے تمام دینی و شرعی اور تمدنی و اجتماعی افکار و نظریات کا اساسی منبع و سرچشمہ ہے۔ اور اس اعتبار سے وہ موجودہ تمام تمدنی و اجتماعی مسائل میں ہماری رہنمائی کرسکتا ہے جو آج ہمارے سامنے ایک سوالیہ نشان بن کر کھڑے ہوگئے ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور کا سب سے اہم ترین مسئلہ دین اور دنیا کے صحیح تعلق اور ارتباط کا مسئلہ ہے۔ یعنی دینی علوم اور جدید علوم میں کس طرح سے ربط قائم کیا جائے اور عصرِ جدید کے تمدنی و سیاسی چیلنج کا، بین الاقوامی سطح پر کس طرح مقابلہ کیا جائے؟ آیا دینِ ابدی اپنے پیروؤں کو عصری علوم و فنون سے لیس ہوکر زندگی کے میدان میں ایک نمایاں رول ادا کرنے کی دعوت دیتا ہے یا ان سے کنارہ کشی اختیار کر کے ایک پس ماندہ ملت کی طرح زندگی گزار دینے کی ہدایت کرتا ہے؟ تو آج اس بارے میں مسلمانوں کے درمیان تین قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں:

۱۔ ایک طبقے کا خیال ہے کہ اسلام صرف دینی و شرعی مسائل کا مجموعہ ہے اور اس کو جدید علوم و مسائل سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ یہ قدامت پسندوں کا طبقہ ہے جو ہر "جدید" چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا ہے اور اس کی افادیت کا منکر ہے۔

۲۔ اس کے برعکس دوسرے طبقے کا خیال ہے کہ اسلام کی اصل اور بنیادی دعوت سائنسی طرز کی ہے اور شرعی امور کا درجہ ثانوی ہے۔ بالفاظِ دیگر اس قسم کے لوگ سائنسی طرزِ فکر کو اصل قرار دے کر شرعی امور کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں یا ان کی تاویل کر کے ان کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تجدد پسندوں کا طریقہ ہے۔

۳۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو ان دونوں انتہا پسندانہ نظریات کے درمیان بغیر کسی اونچ نیچ کے

اسلام کو دین و شریعت اور تمدن و اجتماع دونوں کا مجموعہ سمجھتے ہوئے ہر ایک کو مناسب مقام و مرتبہ دیتا ہے۔ یہ صحیح اسلامیت پسندوں کا نظریہ ہے جو متوازن ہونے کی وجہ سے سب سے بہتر ہے۔ اور قرآن و حدیث کی تمام تعلیمات اسی کی تائید و تصدیق کرتی ہیں۔

اس اعتبار سے اسلام اصلاً دین و شریعت کا مجموعہ ہے، لیکن زمانے کے تقاضوں کے اعتبار سے وہ عصری علوم و فنون سے اخذ و استفادہ کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے، تاکہ اُس کے پیرو دین و دُنیا دونوں کی سعادتوں سے مُتمتّع ہوکر اقوامِ عالم کی امامت کا منصب و کردار بھی بخوبی ادا کرسکیں۔ نیز وہ دنیائے انسانیت کو خیر و شر کے صحیح اسلامی فلسفے سے روشناس کراسکیں۔

دُنیا کا پہلا علم جو انسان کو دیا گیا

(چنانچہ قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سب سے پہلے جو علم عنایت فرمایا تھا وہ علمِ شریعت نہیں بلکہ علمِ فطرت تھا۔ اس کی تعبیر قرآن مجید میں "علمِ اَسماء" یعنی علمِ اشیائے عالم کے عنوان سے کی گئی ہے) انسان کو اس علم کے عطا کئے جانے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اشیائے عالَم اور اُن کے خواص سے بخوبی واقف ہوکر "خلافتِ ارض" کے تقاضوں کو پُورا کرے اور دنیا سے ظلم و عدوان اور فتنہ و فساد کا خاتمہ کرکے زمین کو عدل و انصاف سے بھر دے، تاکہ دُنیا میں پوری طرح امن و امان قائم ہوجائے۔ اور اس اعتبار سے "علمِ اَشیاء" اور "خلافتِ ارض" میں بہت گہرا ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر حسبِ ذیل آیات میں ان دونوں کا بیان ساتھ ساتھ آیا ہے:

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاۗءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۭ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَاۗءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَھُمْ عَلَي الْمَلٰۗئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِــُٔوْنِىْ بِاَسْمَاۗءِ ھٰٓؤُلَاۗءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ

الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ـ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ :

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہُوں تو اُنھوں نے کہا کیا تو ایسی ہستی کو بنائے گا جو زمین میں فساد اور خون ریزی برپا کرے ؟ حالانکہ ہم برابر تیری تسبیح و تقدیس میں لگے ہُوئے ہیں ۔ ارشاد ہُوا کہ مَیں وہ بات جانتا ہُوں جو تُم نہیں جانتے ۔ اور اُس نے آدم کو تمام اَسماء (موجوداتِ عالم کے نام اور اُن کی خصوصیات) بتا دئے ۔ پھر ان تمام موجودات کو فرشتوں کے سامنے (مجسم شکل میں) پیش کر کے کہا کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو (کہ ہمارے علاوہ کسی دوسرے کو خلیفہ بنانے کی کیا ضرورت ہے) تو ذرا مجھے ان چیزوں کے نام تو بتا دو ۔ (کیونکہ خلیفہ بننے کے لئے موجوداتِ عالم سے واقفیت ضروری ہے) ۔ فرشتوں نے عرض کیا کہ تُو پاک ہے، ہم کو (ان چیزوں کا) کوئی علم نہیں ہے، سوائے اس کے جتنا کہ تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ یقیناً تو ہی ہمہ دان اور دانش مند ہے ۔ (تب) ارشاد ہُوا : اے آدم ! ان کو اُن چیزوں کے نام بتا دو ۔ تو آدم نے اُن کو تمام چیزوں کے نام (اسماء اور خواص فرفر) بتا دئے ۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں ہی زمین اور آسمانوں کی تمام پوشیدگیوں سے واقف ہُوں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہُوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم (اپنے دلوں میں) چھپاتے ہو ۔ (بقرہ : ۳۰ ـ ۳۳)

ان آیاتِ کریمہ میں سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ حضرت آدم کو جو اسماء یا "سارے نام" بتا دئے گئے تھے وہ کیا تھے اور خلافتِ ارض سے ان کا کیا تعلق ہے اور موجودہ دور میں اس کی اہمیت کیا ہے ؟ انہی مباحث کی تحقیق اس وقت مطلوب ہے باقی مسائل ضمناً آگئے ہیں ۔

اَسماء یا طبیعی خصائص

لفظ "اَسماء" اِسم کی جمع ہے، جس کا مفہوم اُردو زبان میں عموماً "نام" کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے ۔ مگر عربی زبان میں وہ "علامت" کے معنی پر دلالت کرتا ہے ۔ (اسم الشئ

علامت)[1] اسی طرح وہ کسی ایسی خصوصیت کے لئے بھی بولا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی شناخت کی جاسکے۔ (الاسم ما یُعرف بہ ذات الشئ)[2]

اس لحاظ سے "اسماء" کے معنی "علامتوں" یا "شناختوں" کے ہوئے۔ اور "چیزوں کی علامتوں" سے مراد چیزوں کے آثار و خواص ہوسکتے ہیں، جیساکہ متعدد مفسرین نے اس کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ اس سے مراد دُنیا بھر کی تمام چیزیں اور اُن کے آثار و خواص ہیں۔ گویا کہ آدم اور بنی آدم کو سارے تکوینی علوم عطا کردیئے گئے تھے۔ اب ان آثار و خواص کو جدید اصطلاح کے مطابق "طبیعی خصائص" یا PHYSICAL PROPERTIES کہا جاسکتا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضؓ سے مروی ہے کہ اسماء سے مراد وہی چیزیں ہیں جن سے لوگ متعارف ہیں، جیسے انسان، چوپائے، آسمان، زمین، میدان، سمندر، گھوڑا اور گدھا وغیرہ۔[3] نیز علامہ ابنِ کثیر نے بخاری کی ایک حدیث سے استدلال کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام مخلوقات کے اسماء بتادئے تھے[4] اسی طرح علامہ زمخشری تحریر کرتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ حضرت آدم کو تمام چیزوں کے احوال اور ان سے متعلق دینی و دنیوی منافع بھی بتادیئے گئے تھے۔ (وعلّمہ أحوالھا وما یتعلّق بھا من المنافع الدینیة والدنیویة)[5]

امام رازی، علامہ شہاب الدین آلوسی اور سید رشید رضا وغیرہ مفسرین نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے کہ اسماء سے مراد تمام موجوداتِ عالم اور ان کے آثار و خواص (طبیعی خصائص) ہیں۔ اور بعض مفسّرین نے ایک قدم اور آگے بڑھاکر تمام علوم و فنون کو بھی اس میں شامل

---

[1] القاموس المحیط، مجد الدین فیروز آبادی: ۴/۳۴۴، دار الفکر بیروت۔

[2] المفردات فی غریب القرآن، راغب اصفہانی، ص ۲۴۴، دار المعرفۃ بیروت۔

[3] تفسیر ابن جریر: ۱/۱۷۰، تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۳

[4] تفسیر ابن کثیر: ۱/۷۳، مطبوعہ مصر۔

[5] تفسیر کشاف: ۱/۲۷۲، مطبوعہ ایران۔

کر دیا ہے۔ مثلاً قاضی بیضاوی تحریر کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو چیزوں کی اصل شناخت، اُن کے خواص، اُن کے نام، اُصولِ علم، صناعتوں کے قوانین اور ان صنعتوں میں استعمال ہونے والے اوزار کی کیفیتیں (غرض سب کچھ) بذریعہ الہام بتا دیا تھا[1]

اور طنطاوی جوہری مصری تحریر کرتے ہیں کہ اللہ نے آدم کو اشیاء کی معرفت، ایجاد و اختراع اور تمام صنعتیں الہام کر دیں[2] نیز وہ مزید تحریر کرتے ہیں کہ آدم کے لئے ارض و سما، بر و بحر، چٹیل میدان و مُرغزار، بیابان و کہسار سب مسخر کر دئے گئے۔ اس طرح اُس نے مخلوقات کے تمام اسماء اور خواص و صفات کا علم آدم کو دے دیا، تاکہ وہ ان اشیاء کو اچھی طرح پہچان لے اور ان سے فائدہ اُٹھائے۔ اسی لئے ارشاد ہُوا " وعلّم آدم الاسماء کلّھا "۔ چنانچہ اس ہستی کے لئے جس کی خاطر تمام افلاک و اجرام مسخر کر دئے گئے ہوں، تمام خطوں کو اپنے نظاموں کے ساتھ آراستہ کر دیا گیا ہو اور تمام عوالم اس کو تسخیری سجدہ کر کے اس کی تعظیم و تکریم پر کمربستہ ہو چکے ہوں، بہتر و مناسب تھا کہ وہ ان سب چیزوں کا عرفان حاصل کر لے۔ تاکہ وہ ان کو اچھی طرح سمجھ کر اپنی زبان میں ان کا نطق کرے اور انہیں منظم (کرنے کی صلاحیت پیدا) کرے۔ اسی وجہ سے اس کو ان عوالم کی طرف متوجہ کرنے کی ضرورت پڑی۔ لہٰذا خلاقِ عالم نے ان تمام چیزوں کا تعارف آدم سے بخوبی کرا دیا[3]

چند حقائق و معارف

یوں تو سورۂ بقرہ کی ان آیات میں ہمارے لئے بہت سے اسباق و بصائر ودیعت کر دئے گئے ہیں، مگر اس موقع پر خلافتِ ارض کے تعلق سے صرف چند حقائق کے بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے

۱۔ انسان کو سب سے پہلا جو علم دیا گیا وہ علمِ اشیاء ہے۔ یعنی تمام موجوداتِ عالم اور اُن کی خصوصیات و امتیازات کا علم۔ اس کو ہم مختصر طور پر "علمِ اسماء" یا "علمِ مظاہرِ کائنات "

---

[1] تفسیر بیضاوی : ۱/۶۱ ، مطبوعہ دیوبند

[2] تفسیر الجواہر : ۱/۵۲ ، مصر ، ۱۳۵۰

[3] تفسیر الجواہر : ۱/۵۳

کہہ سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں سائنس جن چیزوں سے بحث کرتی ہے وہ یہی موجوداتِ عالم ہیں' اور جو باتیں بیان کرتی ہے وہ یہی "اشیاء کے آثار و خواص" ہیں۔ طبیعیات (PHYSICS)، کیمیا (CHEMISTRY)، حیاتیات (BIOLOGY)، ارضیات (GEOLOGY)' اور فلکیات (ASTRONOMY) وغیرہ تمام سائنسی علوم کا دائرہ مادی چیزوں اور ان کی خصوصیات ہی کے گرد گھومتا ہے۔ لہٰذا "الاسماء" کو علیٰ وجہ البصیرت سمجھنا سائنسی علوم کے وقوف پر موقوف ہے۔ سائنس نام ہے دنیا میں پائی جانے والی مادی اشیاء اور اُن کی ساخت و پرداخت کے مطالعہ کا۔

۲۔ "تعلیمِ اسماء" کا تعلق "خلافتِ ارض" سے ہے۔ ان دونوں کا بیان ان آیات میں ساتھ ساتھ آیا ہے اور ان دونوں کا آپس میں بہت گہرا ربط و تعلق بھی ہے، جیسا کہ طنطاوی جوہری کے اوپر نقل کردہ اقتباس سے ظاہر ہو رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک انسان اشیائے عالم کی حقیقت' اُن کی ساخت' ان کے اعمال و وظائف اور ان کی طبیعی و نوعی خصوصیات سے بخوبی واقف نہ ہو جائے، اُن سے مستفید نہیں ہو سکتا اور انہیں مسخر کر کے ان میں ودیعت شدہ قوتوں کو کام میں نہیں لا سکتا۔ جب وہ موجوداتِ عالم سے مستفید نہیں ہوگا اور ان کی قوتوں کو زیر نہیں کرے گا تو اس کا خلیفہ ہونا ایک بے معنی بات ہوگی اور خلافتِ ارض کے دیگر تمام مقاصد فوت ہو جائیں گے۔ (تفصیل آگے آرہی ہے) چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تحریر فرماتے ہیں:

" پھر دوسرا جواب حکیمانہ انداز سے آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر ترجیح' اور مقامِ علم میں آدمؑ کے تفوق کا ذکر کر کے دیا گیا، اور بتلایا گیا کہ خلافتِ ارضی کے لئے زمینی مخلوقات کے نام اور ان کے خواص و آثار کا جاننا ضروری ہے اور فرشتوں کی استعداد اس کی متحمل نہیں۔" [۹]

اور صاحب تفسیر الجواہر تحریر فرماتے ہیں کہ جو ہستی اشیائے عالم کے مراتب سے ناواقف ہو وہ ان اشیاء پر خلیفہ ہونے کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ [۱۰]

---

[۹] تفسیر معارف القرآن: ۱/۱۷۸' مطبوعہ دیوبند۔

[۱۰] تفسیر الجواہر: ۱/۵۲

۳ ۔ حضرت آدمؑ کو تمام اشیاء کا علم سکھانے والا خود اللہ تعالیٰ ہے، جو بنصِ قرآنی "معلّم اول" ہے۔ (وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا) ۔ اس لحاظ سے جس علم کی تعلیم خود اللہ تعالیٰ نے دی ہو وہ ہرگز غیر اہم نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس سے اس علم کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور اس کا حصول اولادِ آدم کے لئے بھی ضروری قرار پاتا ہے۔ اس تفصیل سے علم کی فضیلت تو ثابت ہوتی ہی ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ علمِ تکوین یا علمِ مظاہر (NATURAL SCIENCES) کی اہمیت بھی۔

۴ ۔ اس بحث سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ مظاہرِ فطرت اور اُن کے نظاموں کا علم حاصل کرنا غیر اسلامی یا غیر ضروری نہیں، بلکہ وہ خلافتِ ارض کے لئے نہایت ضروری اور مفید ہے۔ کیونکہ وہ "تعلیمِ الٰہی" کے عین مطابق ہے۔

۵ ۔ تفسیر بیضاوی اور تفسیر جواہر کی تصریحات کے مطابق اس علم کی وسعت اور اُس کے اقتضاء میں تمام علوم وفنون بھی داخل ہیں، جن کو موجودہ زبان میں سائنس اور ٹکنالوجی کہا جاسکتا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کیا ہے؟ مادہ (MATTER) اور اس کی قوتوں (ENERGIES) کی جانکاری اور ان سے استفادہ ۔ مثلاً مختلف مصنوعات، کیمیائی مرکبات، انواع و اقسام کے سامانِ تمدن کی تیاری اور برق و بھاپ کو قابو میں کرکے مختلف میدانوں میں بنی نوعِ انسان کو فائدہ پہنچانا۔ چنانچہ آج دنیا میں جتنی بھی صنعتیں (INDUSTRIES) کام کر رہی ہیں اور ان سے جو بھی معاشی و تمدنی فوائد حاصل ہو رہے ہیں وہ سب انہی علوم کی ترقی کی بدولت ہیں۔

۶ ۔ "علمِ اسماء" یا دوسرے لفظوں میں سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کئے بغیر موجودہ دور میں خلافتِ ارض کے تقاضے پورے نہیں ہوسکتے۔ اس لئے ان دونوں میں چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔

۷ ۔ "علمِ اسماء" کی تحقیق کرنا دراصل "خدا کے کاموں" یا خدا کی پیدا کردہ مخلوقات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہے جو بطور "ربوبیت" اس کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظاموں میں جاری و ساری ہیں۔ اس لحاظ سے "خلیفہ" کا ایک کام اور اس کا ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ وہ علمِ اسماء یا "نظامِ ربوبیت" کی تحقیق اور ان کے اسرارِ سربستہ کی نقاب کشائی کرکے مشرک اور بے دین لوگوں کی رہنمائی کرے، جن کو

مظاہرِ کائنات کے سمجھنے میں دھوکا ہُوا ہے' یا جن سے وہ غلط نتائج اخذ کرتے ہیں ۔

۸ ۔ علمِ اسماء کی تحقیق کا سب سے اہم مقصد معرفتِ الٰہی کا حصول ہے ۔ یعنی نظامِ ربوبیت کی تحقیق کے نتیجے میں خدائے تعالیٰ کی بے مثال صفات مثلاً اُس کی وحدانیت' قُدرت' ہمہ دانی (علمِ ازلی)' حکمت و مصلحت' مخلوق پروری' رحمت و رأفت اور اُس کی عجیب و غریب منصوبہ بندی وغیرہ کا بھرپور نظارہ و مشاہدہ بھی ہوجاتا ہے ' جو وحدت الشہود کی منزل ہے ۔ اور اس منزل تک پہنچ جانے کے بعد انسان کو فکری اعتبار سے بھٹکنے کا موقع باقی نہیں رہ جاتا ۔

۹ ۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کائنات کی تمام اشیاء اور اس کی تمام جزئیات کا علم ـــ ان کے خالق و ناظم اور مُدبّر و مُربّی ہونے کی حیثیت سے ـــ حاصل ہے ' ورنہ آدم کی یہ تعلیم (تمام اسماء کی) ممکن نہ ہوتی ۔ اس سے بہت سے فلاسفہ اور اُن کے متبعین کی باطل آرائیوں کی تردید بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کو جُزئیات کا علم نہیں ہے ۔

۱۰ ۔ اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ پوری کائنات اور اُس کے تمام مظاہر ایک نظم و ضبط کے پابند ہیں اور اُن کے اُصولوں میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہورہا ہے ۔ یعنی روزِ اول میں اللہ تعالیٰ نے ان مظاہر کے جو ضوابط مقرر کر دئے تھے ان میں مُرورِ ایّام کے باعث کوئی رَدّ و بدل ممکن نہیں ہے ۔ جن اشیاء اور موجودات کے جو خواص و تاثیرات دورِ آدم میں یا اس سے پہلے متعیّن کر دئے گئے تھے وہی اب تک برابر برقرار چلے آرہے ہیں' جن سے موجودہ انسان بتدریج آگاہی حاصل کر رہا ہے ۔

۱۱ ۔ یہیں سے یہ اُصول بھی نکلتا ہے کہ علمِ دین اور علمِ فطرت میں اصلاً کوئی تعارض و تضاد نہیں ہوسکتا ۔ کیونکہ دونوں ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے اور ہر دو ایک ہی مبدأ فیض کی جانب سے تعلیم کئے ہوئے ہیں ۔

۱۲ ۔ ان آیاتِ کریمہ کا منشا اور تقاضا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولادِ آدم خصوصاً " مسلمان " دُنیا کی تمام چیزوں اور کُل موجوداتِ عالم کا علم حاصل کریں اور عصرِ جدید کے تقاضوں کے مُطابق دینی و دُنیوی ہر حیثیت سے عالمِ انسانی کی رہنمائی کریں ۔

۱۳ ۔ حیرت کی بات ہے کہ جب ہم قرآن مجید میں ان آیات کو پڑھتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں اور

اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے "باپ" نے فرشتوں کے سامنے تمام اسماء کو گن کر اپنی برتری ظاہر کر دی اور اپنی فضیلت کا سکہ بٹھا دیا۔ مگر یہ کوشش کبھی نہیں کرتے کہ اپنے باپ کا یہ علم حاصل کر کے صحیح معنی میں اس کے وارث بنیں اور اس میدان میں اقوام عالم پر اپنی فضیلت و برتری ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ جب کہ دوسری قومیں یہ علم صحیح طور پر حاصل کر کے نہ صرف آفاقِ عالم پر اپنی برتری کا جھنڈا لہرائے ہوئے ہیں بلکہ زندگی کے ہر میدان میں ہم کو نیچا دکھا رہی ہیں۔

۱۴۔ جب حضرت آدم علیہ السلام سے کہا گیا کہ "تم ان کو تمام موجودات کے نام بتا دو"، تو اُنھوں نے یہ تمام نام اور اُن کے صفات "فر فر" بتا دئے، گویا کہ وہ آپ کے لئے ایک رٹا ہُوا سبق تھا۔ مگر آج مُسلمانوں کے سامنے جب "چیزوں کے نام" یا مظاہرِ کائنات کا تذکرہ آتا ہے تو وہ یا تو وحشت زدہ ہو جاتے ہیں یا اُن کو "غیر اسلامی" یا "علمِ غیر" قرار دے کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ حالانکہ یہ سب اشیاء، ان کے خواص اور اُن کی کارکردگیاں انہیں ازبر ہونا چاہئے تھا۔ جیسا کہ اس آیتِ کریمہ سے مترشح ہو رہا ہے:

قَالَ يَا آدَمُ أَنبِئْهُم بِأَسْمَائِهِمْ فَلَمَّا أَنبَأَهُم بِأَسْمَائِهِمْ : ارشاد ہُوا کہ اے آدم تم ان کو تمام چیزوں کے نام بتا دو تو اُنھوں نے اُن کے نام فرشتوں کو بتا دئے۔

۱۵۔ خلاصہ یہ کہ رُوئے زمین پر "خلیفہ" وہی ہو سکتا ہے جو "علمِ اسماء" یا "علمِ آدم" کا صحیح معنی میں وارث ہو۔ یہ ان آیاتِ کریمہ کا عقلی و منطقی نتیجہ ہے۔ اب مسلمان غور کریں کہ وہ اپنے باپ کے اس علم سے کہاں تک بہرہ ور ہیں اور خلافتِ ارض کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کر رہے ہیں۔

علمِ اسماء کی تفصیل

زمانۂ قدیم کا انسان صرف زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، ہوا، پانی، حجر، شجر، گائے، بیل، بکری، اُونٹ، گھوڑا، گدھا، کتا، بلی، لوہا، تانبا، سونا، چاندی، چاول، گیہوں، دال، سبزی، گوشت، انڈا، دودھ اور دہی وغیرہ وغیرہ ہی سے واقف تھا یا چند زراعتی، تمدنی اور جنگی آلات و اوزار وغیرہ سے۔

مگر آج کا انسان ایٹم، الکٹران، پروٹان، نیوٹران، ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن،

کاربن، پوٹاشیم، میگنیشیم، ریڈیم، یورینیم (تمام ۹۲ قدرتی عناصر) برق، بھاپ، ایٹمی قوت، ایٹمی شعاعیں، لاشعاعیں، کائناتی شعاعیں، پروٹوپلازم، امیبا، کروموسوم، کلوروفل، پروٹین، کاربوہائیڈریٹ، وٹامن، آکسیجن، کاربن ڈائی آکسائیڈ، گلوکوز، پنسلین، مختلف قسم کے کیمیادی ایسیڈ اور ان کے مرکبات، ربر اور اُس کی مصنوعات، پلاسٹک اور اُس کی مصنوعات، مختلف قسم کی کیمیادی کھادیں اور ادویات، الکٹرانک آلات، پٹرولیم کی مصنوعات، بے شمار قسم کی مشینیں اور کل پرزے، تھرمامیٹر، بیرومیٹر، فلاسک، ریفریجیٹر، ٹرین، موٹر، ہوائی جہاز، ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی فون، برقی و لاسلکی آلات، ٹرانسیسٹر، ٹیلکس، ٹیلی پرنٹر، راکٹ، مصنوعی سیارے اور خلائی جہاز وغیرہ وغیرہ سے بھی واقف ہے۔

آج کا انسان کرۂ زمین پر تقریباً ساڑھے بارہ لاکھ حیوانات و نباتات کے وجود کا پتہ لگا کر ان کے آثار و خواص کا مطالعہ کر رہا ہے، جو "حیاتیات" کے دائرہ میں آتے ہیں[۱۱] اسی طرح علمِ کیمیا کے تحت آج جن نامیاتی (ORGANIC) اور غیر نامیاتی (INORGANIC) مرکبات (COMPOUNDS) کا مطالعہ کیا جا رہا ہے اُن کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی ہے[۱۲] اسی طرح سماۓ دنیا میں پائے جانے والے لاتعداد ستارے (STARS)، سیارے (PLANETS) اور اربوں کہکشاؤں (GALAXIES) کے نظاموں اور اُن کی خصوصیات کا مطالعہ علمِ فلکیات کے تحت کیا جاتا ہے۔

اس لحاظ سے تحقیقات کا دائرہ جیسے جیسے آگے بڑھ رہا ہے، موجوداتِ عالم یا خُدا کی مخلوقات کی تعداد میں بھی برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ دوربین اور خوردبین کی ایجاد کے بعد تو ہمارے سامنے نئے نئے جہانوں کے ظہور کا ایک تانتا سا بندھ گیا ہے اور ایسے ایسے حقائق منظرِ عام پر آ رہے ہیں جن کے ملاحظہ سے حیرت ہوتی ہے۔

---

(11) ASIMOV'S GUIDE TO SCIENCE, VOL. 2, P. 304, LONDON, 1978

[۱۲] دیکھئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ۹۳/۰۰، ایڈیشن ۱۹۸۳ء

جس طرح قدیم چیزوں سے واقفیت "علمِ اسماء" میں داخل تھی اسی طرح جدید سے جدید تر چیزوں سے واقفیت بھی علمِ اسماء میں داخل ہے۔ بلکہ قیامت تک جتنی بھی نئی نئی چیزیں اور اُن کے خواص دریافت ہوتے جائیں گے وہ سب علمِ اسماء ہی کے دائرہ میں ہوں گے، جن کے دریافت کرنے کی صلاحیت خلاّقِ فطرت نے روزِ اول ہی میں حضرت آدمؑ کے توسط سے بالقوہ تمام انسانوں میں رکھ دی تھی۔

آج کا مسلمان چند وجوہات کی بنا پر ان جدید علوم و فنون یا علمِ اسماء سے پچھڑا ہُوا ہے:

۱۔ آزاد اور علم دوست مسلم حکومتوں کے زوال کے باعث ان علوم میں تحقیق و تفتیش اور طالع آزمائی کا ذوق و جذبہ دلوں سے جاتا رہا۔

۲۔ بعض تاریخی اسباب کی بنا پر دین اور دُنیا کی تقسیم عمل میں آئی تو علماء نے دین کی حفاظت کے خیال سے دنیوی علوم سے کنارہ کشی ہی میں اپنی عافیت سمجھی۔

۳۔ دین اور دُنیا کی اس غلط تقسیم کا نتیجہ یہ ہُوا کہ "علمِ اسماء" کا دیپ اپنوں کے بجائے غیروں کے آستانوں پر جلنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اس کی روشنی سے بھی بدکنے اور دُور بھاگنے لگے۔ اس طرح یہ علم اب ہمارے لئے بالکل اجنبی بلکہ "علمِ غیر" بن کر رہ گیا ہے۔

۴۔ جدید علوم سے بیگانگی کی بدولت ان علوم سے پیدا ہونے والے علمی، معاشرتی اور تمدنی مسائل سے بھی بیگانگی عمل میں آئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اسلام بھی ماضی کی نشانی اور فرسودگی کی علامت سمجھا جانے لگا، حالانکہ وہ ایک زندہ اور ابدی مذہب ہے اور ہر دور میں زندگی کے تمام مسائل حل کرسکتا ہے۔ کوتاہی جو کچھ بھی ہے وہ ہماری اپنی ہے اسلام کی نہیں۔

تسخیرِ اشیاء اور باطنی نعمتیں

بیان چل رہا تھا سائنسی علوم کے پھیلاؤ اور اُن کے مسائل و مباحث کی وسعت کا۔ تو غور فرمائیے کہ یہ تمام علوم، یہ تمام چیزیں اور یہ تمام مسائل و مباحث ہیں کیا سوائے "علمِ اسماء" کی تفصیل کے؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان چیزوں (مادہ و توانائی کے خواص و تاثیرات) کو مسلمان محقق اور سائنس داں دریافت کرتے تو ان کے نام بھی وہ اپنی زبان میں کچھ اور رکھتے، جس کی وجہ سے شاید وہ اجنبیت دکھائی نہ دیتی جو آج نظر آرہی ہے۔

اور دوسری حیثیت سے وہ علوم و فنون کے میدان میں بھی اقوامِ عالم کی رہبری کرکے پوری دُنیا کے امام بنتے۔ جیسا کہ بغداد کے دورِ عباسی اور مسلم اسپین کے دورِ اُموی میں ہم کو نظر آتا ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا (انسان کو علمِ اسماء یا علمِ مظاہر دئے جانے کا بنیادی مقصد تمام مادی چیزوں سے تعارف حاصل کرکے ان میں ودیعت شدہ فوائد سے مستفید ہونا اور خلافتِ ارض کے میدان کو سر کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان مظاہر و موجودات میں انسان کے لئے بے شمار فوائد اور عجیب و غریب نعمتیں ودیعت کردی ہیں، جو اس کی ربوبیت و رحمانیت کا بھی حیرت انگیز مظہر ہیں۔ قرآن حکیم میں صاف صاف فرما دیا گیا ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً): کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے تمہارے لئے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں مُسخّر کردیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردیں؟ (لقمان : ۲۰)

یہاں پر "ظاہری اور باطنی نعمتوں" کی اصطلاحیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ کتبِ تفسیر میں ان کے مختلف مفہوم و مصداق بیان کئے گئے ہیں، جن کو نمبروار بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ بعض کے نزدیک ظاہری نعمتوں سے مراد ظہورِ اسلام اور دشمنوں پر فتح اور باطنی نعمتوں سے مراد فرشتوں کے ذریعہ امداد ہے۔

۲۔ ظاہری نعمتوں سے شکل و صورت کا حُسن اور اعضاء کی درستی اور باطنی نعمتوں سے مراد معرفت ہے۔

۳۔ ظاہری سے مراد حواسِ ظاہری اور باطنی سے مراد عقل اور دل و دماغ ہیں۔ (ان تینوں اقوال کے لئے دیکھئے تفسیرِ کشاف)۔

۴۔ امام رازی کے نزدیک ظاہری سے مُراد جسمانی اعضاء کی درستی اور باطنی سے مُراد ان اعضاء میں کارفرما پوشیدہ قوتیں ہیں۔[۱۳]

۵۔ علامہ زمخشری نے نسبتاً ایک زیادہ بہتر اور فکر انگیز مفہوم بیان کیا ہے جو خود ان کا اپنا قول ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۳ـ تفسیر کبیر: ۶/۵۲۲، مطبع حسینیہ، مصر

الظاهرة كل ما يعلم بالمشاهدة ، والباطنة مالا يعلم الا بدليل أو لا يعلم أصلاً فكم في بدن الانسان من نعمة لا يعلمها ولا يهتدي الى العلم بها : یعنی ظاہری سے مراد ہر وہ نعمت ہے جو مشاہدہ میں آسکے۔ اور باطنی سے مراد وہ نعمت ہے جو کسی دلیل سے معلوم ہو سکے یا بالکل معلوم نہ ہو سکے۔ اس لحاظ سے انسان کے بدن میں کتنی ہی ایسی (پوشیدہ) نعمتیں ہیں جن کو انسان نہیں جانتا اور ان کی طرف راہ یاب نہیں ہوتا۔[۱]

واضح رہے کہ شرعی احکام کے برعکس تکوینی (نیچرل) اُمور سے تعلق رکھنے والی آیاتِ قرآنی کی تفسیر میں مفسرین کے درمیان کافی اختلاف موجود ہے۔ اور اس قسم کی آیات کی تفسیر کبھی مکمل یا "حرفِ آخر" نہیں بن سکتی۔ بلکہ علوم کائنات کی جیسے جیسے ترقی ہوتی جائے گی، ان آیاتِ کریمہ کا بہتر مفہوم اور ان کے حیرت انگیز اعجازی پہلو خود بخود واضح ہوتے جائیں گے، جو دراصل نوعِ انسانی کی فکری و اعتقادی اور تہذیبی و تمدنی ہر اعتبار سے رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں قرآنِ عظیم کا یہ سب سے بڑا اعجاز اور اُس کا حیرت انگیز "ہدایتی" پہلو ہے، جس کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

غرض راقم سطور کے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ظاہری نعمتوں سے مراد وہ نوازشاتِ الٰہیہ ہیں جو آفرینشِ آدم سے لے کر عصرِ حاضر تک برابر معلوم و متعارف چلی آرہی ہیں۔ یعنی وہ لوازمِ حیات جن کے استعمال سے ہر دور کا انسان بخوبی واقف رہا ہے۔ اور باطنی نعمتوں سے مراد خاص کر مادہ (MATTER) اور توانائی (ENERGY) کے وہ پوشیدہ اسرار و حقائق ہیں جو علومِ سائنس کی ترقی کی بدولت منکشف ہو سکے ہیں۔ اور جن کو موجودہ انسان مسخر کر کے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ مثلاً برق، بھاپ، جوہری توانائی (اُس کے مفید پہلو)، جوہری آئی سوٹوپ اور بے شمار کیمیادی مرکبات، جو مصنوعی غذاؤں، دواؤں اور کھادوں اور اسی طرح لاتعداد مصنوعات سے متعلق ہیں۔

یہ تمام نعمتیں روزِ اول ہی سے کائنات میں موجود تھیں۔ مگر انسان ان سے صحیح فائدہ علمِ اسماء کی ترقی اور تسخیرِ اشیاء کی قوت کی بدولت اب جا کر اُٹھا رہا ہے۔

---

[۱] تفسیر کشاف : ۳/۲۲۵ ، مطبوعہ ایران۔

ایک دوسری جگہ ارشادِ باری ہے :

اَللّٰہُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِیَ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ - وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَیْنِ وَ سَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ - وَ اٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ :

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور اُوپر سے پانی برسایا - پھر اس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (طرح طرح کے) میوے نکالے اور کشتیوں کو تمہارے قابو میں کیا، تاکہ وہ سمندر میں اُس کے حکم سے چلتی رہیں (کہ تم جہاں چاہو بآسانی سفر کرسکو) اور دریاؤں کو مسخر کیا (کہ حسبِ منشا ان پر بند باندھو اور ان کا رُخ موڑلو) اور تمہارے لئے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کیا (کہ ان کی توانائیوں سے تم حسبِ خاطر مستفید ہوسکو) اور تمہارے لئے رات اور دن کو کام میں لگایا (تاکہ تمہارے کام کرنے اور راحت پانے کے اوقات معیّن ہوسکیں) اور اس نے (اس طرح) تمہارے (تمام فطری) مطالبات پورے کردیئے - اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کرسکو گے - انسان بڑا ہی ستمگار اور ناشکرا ہے (جو ان نعمتوں سے مستفید ہونے کے باوجود اکثر خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے -) (ابراہیم : ۳۲ - ۳۴)

ایک اور موقع پر ارشاد ہے :

(وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ ، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ) اور اُس نے زمین اور اجرامِ سماوی کی تمام چیزیں تمہارے کام میں لگادی ہیں - یقیناً اس باب میں غور و فکر کرنے والوں کے لئے (بہت سے) دلائل موجود ہیں - (جاثیہ : ۱۳)

ان تمام آیات میں غور کیجئے کہ ان کا منشا و مقصد کیا ہے اور یہ حکم کس کو دیا جارہا ہے؟ تسخیرِ اشیاء کس چیز کا نام ہے؟ اور باطنی نعمتیں کس طرح ظہور پذیر ہوتی ہیں؟ ظاہر ہے کہ یہ حکم " خلیفۃ الارض " کو دیا جارہا ہے کہ وہ علمِ اسماء کے " منتر " اور " دستِ تسخیر " کی قوت سے " باطنی نعمتوں " کو منظرِ عام پر

لائے۔ یہ باطنی نعمتوں یا مادہ اور انرجی کے پوشیدہ حقائق کو منکشف کرنے کا " فارمولا " ہے۔

واضح رہے کہ تسخیر کے لغوی معنے ہیں: کسی کو جبراً کام پر لگانا، رام کرنا، قابو میں کرنا وغیرہ۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ کسی خاص مقصد کے لئے کسی کو زبردستی لے جانا تسخیر کہلاتا ہے، اور مُسَخَّر وہ ہے جس کو کسی کام پر جبراً لگایا گیا ہو[1]۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے اپنے حکمِ ازلی اور قوتِ قاہرہ کے ذریعہ تمام موجوداتِ عالم کو انسان کے خادم اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے مختلف کاموں پر مامور کر رکھا ہے اور ان میں مخفی طور پر بے شمار فوائد ودیعت کر دئے ہیں۔ اب انسان کا کام اپنے خلیفہ ہونے کی حیثیت سے یہ ہے کہ وہ ان "خُدّام" سے اپنی عقل و دانش اور ضرورت کے مطابق خدمت لے اور ان مخفی فوائد کا پتہ لگا کر اور اپنے تمدنی مشکلات حل کر کے دنیائے انسانیت کے گیسو سنوارے۔ ارشادِ باری " وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ " (اور اُس نے تمہارے تمام فطری مطالبات پورے کر دئے) کے مطابق انسان کی کوئی مشکل اور اُس کی کوئی فطری و تمدنی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کا حل " ضروریات سے بھرپور " اس کائناتِ ارضی میں موجود نہ ہو۔ ان صاف ارشادات کے باوجود ان نعمتوں سے مستفید نہ ہونا محرومی نہیں تو پھر کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ ان خدائی نعمتوں سے بھرپور استفادے کے لئے جدید علوم سے واقفیت اور ان میں دسترس حاصل کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

غرض اس اعتبار سے مادہ اور انرجی کے اصولوں کو کام میں لانے کے باعث مختلف ایجادات و اختراعات کی شکل میں " نعمتوں " کی بارش ہونے لگتی ہے۔ جیسے بجلی اور بھاپ سے چلنے والی ہزاروں قسم کی مشینیں، موٹر، ٹرین، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی پرنٹر وغیرہ بہت سی تمدنی ضروریات۔ اسی طرح فنِ زراعت میں استعمال ہونے والے جدید آلات، مشینیں اور کیمیادی کھادیں، طبِ جدید میں استعمال ہونے والے آلات، مشینیں اور ادویات وغیرہ۔ مگر سب سے زیادہ مفید اور حیرت انگیز ترقی شاید طبیعیات (فزکس) اور کیمیا (کیمسٹری) کی ترقی کی بدولت عمل میں آئی ہے۔ اور اس وقت دُنیا میں جتنی بھی صنعتیں کام کر رہی ہیں، چاہے وہ مشینوں کی تیاری سے متعلق ہوں یا ادویات، کھادوں اور دیگر مصنوعات کی تیاری سے متعلق، سب میں

---

[1] مفرداتُ القرآن، از راغب اصفہانی، مطبوعہ بیروت۔

بنیادی طور پر ان علوم کا عمل دخل نظر آتا ہے۔ صرف اکیلے پٹرولیم ہی سے اس وقت دُنیا میں ہزاروں کیمیاوی صنعتیں پل رہی ہیں۔ جیسے موم، الکحل، مصنوعی ربر، وارنش، پلاسٹک، خوشبویات، مصنوعی ریشے اور دھماکہ خیز مادے جیسے گولہ بارود وغیرہ۔ چنانچہ عربوں سے سستا تیل حاصل کرکے مغربی قومیں محض اپنی جانکاری یا "علمِ اسماء" میں مہارت کی بدولت اس سستے تیل سے مختلف کیمیاوی مصنوعات (PETROCHEMICALS) تیار کرکے خوب نفع کماتی ہیں۔

اسی طرح لوہے اور فولاد کی ہزاروں صنعتیں، الکٹرانک آلات کی ہزاروں صنعتیں، پلاسٹک کی ہزاروں صنعتیں اور ربر کی ہزاروں صنعتیں کام کر رہی ہیں۔ یہی حال دیگر تمام اشیاء کا بھی ہے کہ ہر ایک مادہ یا چیز (اسم) سے سینکڑوں ہزاروں چیزیں (مصنوعات) تیار ہو رہی ہیں۔ تمدنِ جدید میں لوہے کی مصنوعات اور الکٹرانک آلات کی حیثیت ریڑھ کی ہڈی کی طرح ہے۔ اگر موجودہ تمدن سے ان دو چیزوں کو ہٹا دیا جائے تو شاید اس کے ڈانڈے تمدنِ قدیم سے مل جائیں۔

ان علوم اور ان کے فوائد سے قطع نظر صرف معاشیاتی نقطۂ نظر سے غور کیجئے کہ یہ صنعتیں کتنی اہم ہیں! قوموں کی ترقی اور ان کی خوش حالی کا دار و مدار ان صنعتوں (INDUSTRIES) پر کتنا ہے! اس وقت روئے زمین پر یقیناً ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں صنعتیں کام کر رہی ہیں اور دُنیا کی قوموں کے درمیان اس سلسلے میں سخت مقابلہ چل رہا ہے۔ کروڑوں آدمی مختلف مصنوعات کی تیاری میں لگے ہوئے ہیں۔ اور اس اعتبار سے جس طرح انسانی تمدن ترقی کر رہا ہے اسی طرح فوجی و عسکری میدان میں بھی خوب پیش قدمی اور سخت مقابلہ ہو رہا ہے۔ اس طرح آج قوموں کی زندگی صنعتوں سے وابستہ ہو کر رہ گئی ہے اور جو قوم اِس وقت "بے صنعت" ہے وہ گویا کہ فقیر اور کنگال ہے، جو دُنیا کے اسٹیج پر زیادہ دنوں تک ٹھہر نہیں سکتی کیونکہ یہ سرزمین "زورآوروں" کا مسکن و ماویٰ ہے۔ یہاں پر جو کمزوری دکھائے گا وہ قانونِ قُدرت کے مُطابق پیس کر رکھ دیا جائے گا، جیسا کہ فلسفۂ تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہر دور کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ زندہ قوموں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال لیں ورنہ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دی جائیں گی، یا ان کو تاریخ کے "عجائب خانوں" کے حوالے کر دیا جا سکتا ہے۔ گویا کہ وہ مُردہ قومیں ہیں اور ان کا

مقام دنیا کے اسٹیج کے بجائے میوزیم ہی زیادہ مناسب ہو سکتا ہے۔

منصبِ خلافت

غرض خلّاقِ فطرت نے یوم ازل ہی میں تمام مظاہرِ کائنات کے چند قوانین و ضوابط مقرر کیئے۔ پھر ان کا علم انسان کو عطا فرمایا کہ ان مادی قوانین و ضوابط سے آگاہی حاصل کر کے موجوداتِ عالم سے فائدہ اُٹھائے، جس کے باعث "نئی نئی نعمتیں" ظاہر ہونے لگتی ہیں، جن کا تذکرہ " وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً " اور " وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا " میں کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ جو قوم ان علوم سے واقف ہوگی اور منشائے خداوندی کے مطابق موجوداتِ عالم کی تسخیر کرے گی وہی خلافتِ ارض کی اصل مستحق ہوگی۔ حصولِ خلافت کے لئے تسخیراتِ موجودات ضروری ہے۔ اور تسخیرِ موجودات کی کنجی علمِ اسماء (علمِ اشیائے عالم) ہے۔ لہٰذا علمِ اسماء خلافتِ ارض کا پہلا باب اور اُس کا اولین زینہ ہے۔ اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ جو قوم اس باب میں پیچھے رہ جائے وہ "منصبِ خلافت" سے بطورِ سزا معزول کر دی جاتی ہے۔ یعنی دوسروں کی غلام یا اُس کی دست نگر بنا دی جاتی ہے۔ کیونکہ قانونِ خداوندی کے مطابق اس دُنیا میں کاہلوں کا کوئی کام نہیں ہوتا۔

بہر حال اب ایک دوسری حیثیت سے غور فرمایئے۔ قرآنِ حکیم میں اہلِ ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ، وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ : اور تم اُن سے لڑائی کے لئے اتنی قوت اور زور آور گھوڑے تیار کرو، جتنا کچھ کہ تم کر سکتے ہو، تاکہ اس سے تم اللہ کے اور تمہارے دشمنوں پر دھاک بٹھا سکو، اور ان کے علاوہ بعض دوسری قوموں پر بھی جن کو تم (اس وقت) نہیں جانتے (مگر) اللہ ان کو جانتا ہے۔ اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پورا ملے گا، اور تمہارا حق مارا نہیں جائے گا۔ (انفال : ٦٠)

صحیفۂ خداوندی میں سیدو... کی عبارت ملحوظ رکھنی گئی ہے چنانچہ اس آیت کریمہ میں گھوڑوں کا

لفظ دورِ قدیم کی رعایت سے لایا گیا ہے اور مابعد کے ادوار کی رعایت سے " قوۃ " کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔
اس سے مراد ہر قسم کی قوت اور جدید سے جدید تر سامانِ جنگ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح " اللہ کے اور تمہارے دشمنوں"
سے مراد کفار و مشرکین ہیں اور " ان کے علاوہ بعض دوسری قوموں " سے مراد مابعد کی اقوام ہیں۔ " تاکہ تم دشمنوں
پر دھاک بٹھا سکو " یہ مقصد عسکریت، فلسفۂ جنگ، خلافتِ ارض کی غرض و غایت اور امنِ عالم کی بنیادی
اینٹ ہے۔ یعنی محض اس رعب و دبدبہ ہی کی بدولت تمہیں امن و امان، دوچین و سکون حاصل ہو سکتا ہے، ورنہ
ظاہر ہے کہ ضعف اور کمزوری کی بدولت ہر قوم اور ہر ملک — جو زور آور ہو — دبانے اور حق مارنے لگ جائے گا۔
کیونکہ عسکری اعتبار سے قوموں کی کمزوری قوموں کی موت کے برابر ہوتی ہے۔

یہ آیتِ کریمہ بیک وقت نہ صرف حتی المقدور جنگ کی تیاری اور اس راہ میں انفاق کی ترغیب و
تحریص دلا رہی ہے بلکہ خلافتِ ارض کا فلسفہ بھی سمجھاتے ہوئے اپنے متبعین کو چالاک دشمنوں سے چوکنا اور ہوشیار
رہنے کی تلقین بھی کر رہی ہے۔ یہ اور اس سے ماقبل کی آیات میں خلافتِ ارض کے تعلق سے اسباق و بصائر کا
ایک بحرِ زخار موجزن نظر آرہا ہے، جن کو مختصر طور پر اس کاغذی پیرہن میں سمیٹنے کی کوشش کی جائے گی:

۱۔ اس آیتِ کریمہ کا منشا جیسا کہ ظاہر ہو رہا ہے " فتنوں " کو کچلنے اور باطل سے نبرد آزمائی کے لئے
بہتر سے بہتر ہتھیاروں کی تیاری ہے۔ آج تیر، کمان، تلوار اور نیزے کا دور نہیں رہا۔ بلکہ بندوقوں، مشین گنوں
اور ٹینکوں کا دور بھی بہت بڑی حد تک ختم ہو گیا ہے۔ اب راکٹ، میزائل، ایٹم بم، ہائیڈروجن بم، نیوٹران بم،
جراثیمی بم، خلائی سیاروں اور اسٹار وار کا دور ہے۔ اب انسان خلا میں بیٹھ کر جنگ کرنے اور اجرامِ سماوی
میں فوجی چھاؤنیاں قائم کرنے کی فکر میں ہے۔ تاکہ وہ اپنا دفاع مضبوط کر کے ایک ہی وار میں اپنے دشمنوں کا صفایا
کر سکے۔

۲۔ اقوامِ عالم کو قابو میں رکھنے کے لئے جدید سے جدید تر ہتھیاروں سے لیس ہونا ضروری ہے۔
اس کے بغیر " تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ " کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ مقصد " بھیک "
کے چند ہتھیاروں کو جمع کر لینے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس کے لئے بذاتِ خود جد و جہد کرنے اور خود کفیل
بننے کی ضرورت ہے۔

۳ ۔ جب تک اقوام عالم کو قابو میں نہ کیا جائے دنیا میں حقیقی امن و امان قائم نہیں ہو سکتا ، جو اسلام اور کارِ خلافت کا اولین مقصد ہے ۔

۴ ۔ اگر مسلمان علوم و فنون کے باب میں امام ہوتے تو وہ منشائے الٰہی کے مطابق "تسخیرِ اشیاء" کا صرف افادی پہلو مدنظر رکھتے اور اس کے مضر و ہلاکت خیز پہلوؤں سے گریز و اجتناب کرتے ۔ آج حال یہ ہے کہ دنیا کی جنگ باز قومیں دنیائے انسانیت پر جوہری اور جراثیمی جنگ مسلط کر کے تمام انسانوں کو موت کی نیند سُلا دینے کے درپے نظر آ رہی ہیں ۔ یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ علم اسماء "صالح" ہاتھوں سے نکل کر "غیر صالح" ہاتھوں میں پڑ گیا اور انہیں قابو میں رکھنے والی کوئی مؤثر قوت باقی نہیں رہ گئی ۔

۵ ۔ موجوداتِ عالم کی تسخیر سے متعلق اُوپر جو آیات پیش کی گئی ہیں ان سب میں نعمتوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ لفظ " لَکُمْ " (تمہارے لئے) بار بار استعمال کیا گیا ہے ۔ اس میں " لام " عربی گرامر کے مطابق " افادیت " یا حصولِ منفعت پر دلالت کر رہا ہے ۔ اس لحاظ سے مطلب یہ ہُوا کہ " تسخیرِ اشیا " میں دنیائے انسانیت کا فائدہ اور تعمیری پہلو مدنظر ہونا چاہئے ۔ پھر لفظ " نعمت " کا مفہوم بھی یہی ہے کہ وہ نوعِ انسانی کے لئے زحمت یا مصیبت نہ بنے بلکہ وہ خدائے رحمان کا عطیہ ہونے کی حیثیت سے ہر حال میں اس کی رحمت و رأفت کا مظہر رہے ۔

۶ ۔ اس لحاظ سے اسلام کی نظر میں جوہری بموں ، نیپام بموں ، جراثیمی بموں اور دیگر ایٹمی اسلحہ کا استعمال بہت بُرا اور سخت گناہ کی چیز ہے ، جو عالم انسانی کی تباہی و بربادی کا باعث ہے ۔ تمام بنی نوع انسان اسلامی نقطۂ نظر سے " عیال اللہ " (اللہ کا کنبہ) ہیں ، جن کی تباہی و بربادی کی وہ اجازت نہیں دیتا ۔ مگر اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب دوسری قومیں ایٹم بموں وغیرہ سے مسلح ہیں تو کیا مسلم حکومتوں کو بھی ان کی تقلید کرنی چاہئے ؟ تو اگرچہ یہ اقدام اسلام کی نظر میں بہت بُرا اور قبیح ہے مگر طاقت کے توازن کو برقرار رکھنے اور ذہنی و نفسیاتی فضا کو تبدیل کرنے کے لئے اس کی تیاری کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا ۔

۷ ۔ طاقت کا توازن قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا اور ہے کہ مسلم حکومتیں نہ صرف اقوام عالم کی برابری کرتیں بلکہ ان سے ایک درجہ آگے بھی رہتیں ۔ مگر اس وقت دنیا کی مسلم حکومتوں کا حال یہ ہے کہ جو تعداد میں پچاس کے

لگ بھگ ہیں ــ کہ وہ نہ صرف اس میدان میں انتہائی کمزور ہیں، بلکہ اسلحہ اور ہتھیاروں کے لئے بڑی طاقتوں کی دست نگر بھی۔ یہ حقیقت میں اس بات کی سزا ہے کہ وہ تسخیرِ اشیاء یا کم از کم علمِ اسماء کے میدان میں پیچھے کیوں رہ گئیں۔

۸ ـ طاقت کے اعتبار سے "قومی کمزوری" دراصل قومی موت کے مترادف ہے۔ اور یہ قانون فطری، شرعی، تاریخی، سیاسی، عسکری اور بین الاقوامی ہر اعتبار سے صحیح ہے۔ یہ صحیفۂ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ کمزور قومیں اس کائنات میں زیادہ دنوں تک قومی حیثیت سے زندہ نہیں رہ سکتیں۔ بلکہ وہ جلد یا بدیر غالب اور طاقتور قوموں کا لقمۂ تر بن جاتی ہیں۔

۹ ـ مقصدِ خلافت اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان قومیں تسخیرِ اشیاء کے میدان میں خود آگے نہ بڑھیں اور "مادہ" میں ودیعت شدہ قوتوں کو زیر کرکے ان کا صحیح استعمال نہ سیکھ لیں۔ بالفاظِ دیگر سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں خاطر خواہ ترقی نہ کرلیں۔ اس وقت مسلم ممالک کے پاس وسائل کا ایک انبار موجود ہے۔ لہٰذا اگر وہ صحیح سمجھ بوجھ سے کام لیں تو بہت جلد کایا پلٹ سکتی ہے اور موجودہ مایوس کن صورتِ حال بدل سکتی ہے۔

۱۰ ـ دنیائے اسلام آج باہمی اختلافات کا شکار ہو کر آپس ہی میں دست بگریباں نظر آ رہی ہے اور بجائے تعمیر کے تخریب کی راہ پر گامزن دکھائی دے رہی ہے جو بڑی طاقتوں کی عیارانہ سیاست کا نتیجہ ہے۔ اس باہمی نزاع اور چپقلش کی بدولت عالمِ اسلام کی توانائی ضائع ہو رہی ہے جو یقیناً کسی تعمیری کام میں لگ کر پورے عالمِ اسلام کا بھلا کر سکتی تھی۔ اگر مسلم ممالک موجودہ بین الاقوامی صورتِ حال کے پیشِ نظر اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے باہمی اختلافات کو فراموش نہیں کر دیتے تو پھر انھیں اغیار کی ہوسناکیوں کی بھینٹ چڑھنے اور ان کا لقمۂ تر بننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ نے تو صاف فرما دیا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ : اور تم آپس میں نزاع نہ کرو، ورنہ تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ (انفال : ۴۶)

11 ـ کارِ خلافت کیا ہے؟ اس پر حسبِ ذیل آیتِ کریمہ بخوبی روشنی ڈال رہی ہے، جیساکہ

حضرت داؤد علیہ السلام کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ:

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تم لوگوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرو۔ (ص: ۲۶)

خلیفہ ہونے کا صاف مطلب یہ ہُوا کہ دُنیا میں عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ظلم و زیادتی کو مٹایا جائے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ کوئی کمزور شخص یا کمزور قوم زمین میں عدل و انصاف قائم نہیں کر سکتی۔ عدل و انصاف کے قیام کے لئے بھی قوت و طاقت کی ضرورت ہے تاکہ کمزوروں کو ظالموں سے اُن کا حق چھین کر دلایا جائے اور دُنیا میں امن و امان قائم کیا جائے۔ یہ اصول نہ صرف معاشرتی اور قومی لحاظ سے صحیح ہے بلکہ بین الاقوامی حیثیت سے بھی درست ہے۔ کیونکہ "ظالم" انسان یا ناحق کوش قوم صرف "طاقت" ہی کے آگے سر جھکا سکتی ہے اور اخلاقی وعظ و نصیحت اُس کے لئے مؤثر اور کارگر نہیں ہوتی۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ:

پھر ہم نے ان (قوموں کی تباہی) کے بعد تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیا کرتے ہو؟ (یونس: ۱۴)

۱۲۔ پچھلے تمام مباحث میں آپ کسی بھی اعتبار سے غور کیجئے آپ کو نظر آئے گا کہ دنیائے اسلام کا ہر حیثیت سے قوی اور طاقتور ہونا ضروری ہے۔ یہی خُدا کا پیغام اور اسلام کا مطالبہ ہے۔ خُدا کے احکام اور زمانے کے تقاضوں سے رُوگردانی کر کے ہم کافی سزا بھگت چکے ہیں۔ لہٰذا اب ہم کو پوری طرح ہوش میں آجانا چاہیئے۔ واضح رہے کہ علم تکوین یا جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا عدم وجود افراد کی زندگیوں میں تو اتنا اہم دکھائی نہ دے مگر قوموں کی زندگیوں میں اس کا عدم وجود اُن کی موت کا پیام ہوگا۔ افراد ہی سے قومیں بنتی ہیں اور قطرہ قطرہ مل کر ہی دریا کہلاتا ہے۔ آج دُنیا کے اسٹیج پر کوئی قوم زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکتی جو اس میدان میں پیچھے رہ گئی ہو۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ دورِ جدید میں محض اپنی طاقت اور وسائل کے اعتبار سے "بڑی قومیں" عددی اعتبار سے بڑی مگر طاقت کے اعتبار سے "کمتر قوموں" کو اپنی انگلیوں کے اشاروں پر نچا رہی ہیں۔ اور اس دُنیا میں وہی ہو رہا ہے جو وہ چاہتی ہیں۔ آخر ان کے پاس وہ کونسی کنجی اور وہ کونسا منتر ہے، جس کے باعث ان کی یہ فسوں کاری چل رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ اُن کی یہ کنجی یا منتر ہے صرف اور صرف "علم اسماء"

اور "تسخیرِ اشیاء" میں ان کی جانکاری اور برتری ۔ یہ دونوں چیزیں ہماری تھیں اور ہم ہی ان کے اصل وارث تھے ۔ مگر ہماری غفلت کے باعث یہ چیزیں غیروں میں چلی گئی ہیں ۔ اب ہم کو کوشش کرکے دوبارہ اس میدان میں آگے بڑھنا اور ان دونوں چیزوں پر پھر سے قبضہ کرلینا چاہیے ۔

خلافتِ ارض کی شرائط

صحیفۂ ربانی میں خلافتِ ارض کے تعلق سے اُمتِ اسلامیہ سے جو زبردست اور تاکیدی وعدہ کیا گیا ہے وہ اس اُمت کے لئے پیامِ حیات کی حیثیت رکھتا ہے :

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ : جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور صالح عمل کرتے رہے ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں ضرور خلیفہ بنائے گا جیسا کہ ان سے پہلے والوں کو بنایا تھا ۔ اور ان کے دین کو ـــ جس کو اُس نے اُن کے حق میں پسند کرلیا ہے ـــ مضبوطی سے جما دے گا ۔ اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا ۔ (شرط یہ ہے کہ) وہ میری عبادت کرتے رہیں (اس طرح کہ) کسی کو میرا شریک نہ بنائیں ۔ اس (واضح حکم) کے بعد جو سرتابی کریں گے تو وہی لوگ بدکردار ہوں گے ۔ (نور : ۵۵)

یعنی اللہ کی عبادت اس طرح ہو کہ اس میں کسی قسم کے شرک کا شائبہ تک بھی نہ ہو ، نہ انفرادی زندگی میں اور نہ اجتماعی زندگی میں ۔ شرک کی یوں تو بہت سی قسمیں ہیں ، جن میں سے ایک غیر اللہ کی مطلق عبادت بھی ہے ۔ اور اہلِ ایمان سے شرک نہ کرنے کا مطالبہ یہاں پر شاید یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے خصوصی معاملات میں غیر قوموں کو حکم نہ بنائیں اور بے چون و چرا ان کے احکام کی تعمیل نہ کریں ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے :

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ۔ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ : اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد

لکھ دیا کہ زمین کے وارث (آخرکار) میرے صالح بندے ہوں گے۔ اس میں عبادت گزاروں کے لئے ایک بہت بڑا پیغام ہے۔ (انبیاء : ۱۰۵ - ۱۰۶)

یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کی بخوبی تشریح و تفسیر کر رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اگرچہ خلافتِ راشدہ کے دور میں پورا ہو چکا ہے، مگر یہ پیامِ حق ایک مژدۂ جاوید ہے جو ہر دور کے لئے مشروط طور پر عام ہو سکتا ہے، جیسا کہ علامہ ابنِ کثیر نے تصریح کی ہے [۱۱]

پہلی آیت میں "زمین میں خلیفہ بنائے جانے" کے لئے بنیادی شرط ایمان اور عملِ صالح قرار دی گئی ہے۔ پھر اسی کو مختصر طور پر "عبادت" (یعبدوننی) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح دوسری آیت میں بھی "صالحین" ہی کو "عابدین" کہا گیا ہے۔ اس لحاظ سے عبادت سے مراد "عملِ صالح" ہوا۔ اور عملِ صالح قرآن حکیم کی ایک وسیع اصطلاح ہے، جس میں تمام شرعی و اخلاقی احکام و اوامر داخل ہیں اور جہاں دانی و جہاں بانی بھی اس عملِ صالح میں داخل اور اس کا ایک ضروری حصہ ہے۔ اس کے بغیر نہ تو کوئی مسلم معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ "عملِ صالح" کو قرار و ثبات حاصل ہو سکتا ہے۔ مسلم معاشرہ کو وجود میں لانے اور اس کی حفاظت کرنے کے لئے جہاں دانی و جہاں بانی کی بھی ضرورت ہے۔ جیسا کہ دورِ رسالت اور دورِ خلافتِ راشدہ کے حالات و واقعات اور کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ وغیرہ کے ساتھ درپیش معرکہ آرائیاں شاہد ہیں۔ اس لحاظ سے کسی کمزور قوم اور کمزور معاشرہ میں عملِ صالح یا احکامِ الٰہی کا مکمل ظہور و نفاذ بہت مشکل دکھائی دیتا ہے، جیسا کہ آج خصوصیت کے ساتھ ایران، پاکستان اور افغانستان کے حالات شاہد ہیں۔ اقوامِ عالم اور خاص کر بڑی طاقتیں اسلامی قوانین کے نفاذ یا اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور اس کے دُور رس عواقب و نتائج سے لرزاں و ترساں دکھائی دیتی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ آج مسلم حکومتوں اور مسلم معاشروں کو برباد کر دینے پر تُلی ہوئی ہیں۔

غرض ان آیات میں "عملِ صالح" سے مطلوب محض چند رسوم و عبادات نہیں بلکہ ایک مکمل اور مثالی عمل کا نمونہ مطلوب ہے، جو ہر اعتبار سے "صالح" ہو۔ یعنی دینِ برحق کو مضبوط بنیادوں پر قائم و دائم رکھنے کی تمام تدبیروں پر عمل پیرائی جس کے باعث وہ ہر قسم کے خوف اور اندیشوں سے مامون و محفوظ ہو جائے۔ اور

---

[۱۱] دیکھئے تفسیر ابنِ کثیر : ۳/۳۰۲

اس مثالی عمل و کردار سے مزین و آراستہ افراد ہی کو سورۂ انبیاء والی آیت میں " الصّٰلحون " کہا گیا ہے، جو زمین کے وارث ہوں گے ۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ایسی ہی صالح اور مثالی قومیں جو کارزارِ حیات میں سرگرم عمل ہوں، کشور کشا ہو سکتی ہیں اور اپنے ملکوں کو اغیار کی دستبرد سے بچا سکتی ہیں ۔

یہاں پر یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ اُمتِ مسلمہ کو وسائل سے زیادہ توکل علی اللہ پر تکیہ کرنا پڑتا ہے اور تاریخ اسلام میں بارہا اس کا مشاہدہ بھی ہو چکا ہے۔ مگر وسائل کو کُلی طور پر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ قرآن مجید میں تو صاف طور پر مقدور بھر وسائل کے اکھٹا کرنے پر زور دیا گیا ہے، جیسا کہ سورۂ انفال والی اُوپر مذکورشدہ آیت کریمہ سے ظاہر ہوتا ہے ۔ اور سنتِ نبوی سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف غزوات و سرایا کے لئے مقدور بھر وسائل اکھٹا کرتے تھے اور ان کے لئے مادی نقطۂ نظر سے تیاریاں کرتے تھے ۔ اس اعتبار سے اُمتِ مسلمہ کو روحانیت کے ساتھ ساتھ مادیت کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے اور بغیر کسی افراط و تفریط کے ان دونوں کے فوائد سے مستفیض و متمتع ہونا چاہیئے۔ اسلام ان دونوں اُمور میں اعتدال قائم کرنے کی تعلیم دیتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں اور ان دونوں میں سے کسی ایک چیز پر تکیہ کر کے دوسری چیز کا استخفاف نہیں کیا جا سکتا، ورنہ اس کا بُرا نتیجہ ضرور سامنے آئے گا ۔

بہرحال ان آیات میں اہلِ ایمان سے تین چیزوں کا وعدہ کیا گیا ہے جو یہ ہیں :

۱ ۔ ان کو زمین کی خلافت سونپی جائے گی ۔ (استخلاف فی الارض)

۲ ۔ ان کے دین کو مضبوط و مستحکم کیا جائے گا ۔ (تمکین دین)

۳ ۔ خوف و دہشت کی فضا دُور کر کے امن و سلامتی عطا کی جائے گی ۔ (تبدیل الخوف من الامن)

یہی تین چیزیں ہیں جن کی آج دُنیائے اسلام کو شدید ضرورت ہے ۔ اور ان تینوں چیزوں میں غور فرمایئے تو صاف واضح ہو جائے گا کہ مؤخرالذکر دو چیزوں کا حصول ہی اصل میں خلافت (پہلی چیز) کی بنیاد ہے ۔ یعنی خلافت نام ہے دین کی مضبوطی اور خوف و دہشت کے عدم وجود کا ۔ بالفاظ دیگر

وہی "عملِ صالح" کا مکمل اور بے خوف و خطر ظہور و نفاذ جس کو "دین کی مضبوطی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے جب تک یہ دونوں چیزیں (دین کی مضبوطی یا عملِ صالح کا بے روک ٹوک نفاذ اور دُنیا کی معاصر قوموں سے پوری پوری بے خوفی) حاصل نہ ہو جائے خلافتِ ارض ایک بے معنی لفظ رہے گا، چاہے رُوئے زمین پر پچاس کے بجائے پانچ سو مُسلم حکومتیں وجود میں آجائیں۔ لہٰذا یہ تینوں چیزیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہم عصرِ جدید کے تقاضوں کے مُطابق خود کو کیل کانٹوں سے پوری طرح لیس نہ کر لیں اور اقوامِ عالم کے مقابلے کے لئے دفاعی حیثیت سے اپنے آپ کو پوری طرح تیار نہ کر لیں۔

موجودہ ناگفتہ بہ حالات سے بد دل اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اپنے تمام وسائل کا جائزہ لے کر مثبت بنیادوں پر عالمِ اسلام کی تعمیرِ نو میں لگ جانے اور عہدِ نو کا زریں باب کھولنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ یقیناً سچا ہے اور وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا، بشرطیکہ ہم نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیں۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَكَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا : وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام ادیان پر غالب کر دے۔ اور اللہ کافی ہے حق ثابت کرنے والا۔ (فتح : ۲۸)

علوم و فنون امام غزالی کی نظر میں

امام غزالی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "احیاء العلوم" میں "علم" کی ایک فکر انگیز تقسیم کی ہے، جس کے مطابق بعض غیر شرعی علوم تک کو "فرضِ کفایہ" قرار دے دیا ہے، جن کے عدمِ وجود کے باعث معاشرہ اجتماعی حیثیت سے کسی مشکل یا خرابی میں پڑ سکتا ہو، جیسے علمِ طب اور حساب وغیرہ۔ حتیٰ کہ موصوف نے مختلف قسم کی صنعتوں کو بھی فرضِ کفایہ قرار دے دیا ہے، مثلاً نشتر زنی (علاج کی غرض سے نشتر لگا کر فصد کھولنا جس کا دورِ قدیم میں رواج تھا)، کاشتکاری، پارچہ بافی اور درزی کا کام وغیرہ۔[1] اس لحاظ سے موصوف اگر آج زندہ ہوتے تو تعجب نہیں کہ موجودہ دور کے سائنسی علوم کو، ہماری ملّت کی موجودہ زبوں حالی کے پیشِ نظر، فرضِ کفایہ ہی نہیں بلکہ فرضِ عین قرار

---

[1] احیاء العلوم ۱/۱۶ مطبوعہ بیروت

دے دیتے، جن سے آج قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہو گیا ہے۔

غرض اسلام ایک ابدی و سرمدی مذہب ہے، جو دین و دنیا دونوں کا جامع اور ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے۔ وہ دیگر مذاہب کی طرح ترکِ دُنیا اور عُزلت وگوشہ نشینی کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ کارزارِ حیات کو گرم کرنے اور تمدنی ہنگامہ آرائیوں میں کود پڑنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اپنے متبعین کو تارک الدنیا' ضعیف اور کمزور نہیں بلکہ ایک سرگرم' فعّال' خود کفیل اور طاقتور قوم کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مثبت اندازِ فکر اور متوازن طریقۂ تعلیم ہے جس کا تصور ہمیں دُنیا کے کسی بھی دوسرے مذہب میں نہیں ملتا۔

اقوامِ عالم کی رہنمائی

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور اُس کی نصرت اُسی وقت شاملِ حال ہو سکتی ہے جب کہ اہلِ اسلام اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل پیرائی کے جذبہ کے ساتھ سرگرم عمل ہو جائیں اور ہر حیثیت سے میدانِ کارزار کو گرم کر کے خلافتِ ارض کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوں۔ نیز دینی و دنیوی ہر حیثیت سے مُسلم معاشرہ کی خصوصاً اور اقوامِ عالم کی عموماً ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے کر موجودہ بین الاقوامی خطرات اور ہلاکت خیزیوں سے عالمِ انسانی کو نجات دلائیں۔ خلافتِ ارض کی یہ وہ عظیم ترین ذمہ داری ہے جو اس وقت مسلم قوموں کے کندھوں پر اللہ تعالیٰ نے ڈال رکھی ہے۔ موجودہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اُمید اور روشنی کی کوئی کرن اگر نظر آرہی ہے تو وہ اسلام اور دُنیائے اسلام ہی کی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مُسلم قومیں اپنا یہ پارٹ اور وقت کا سب سے بڑا کردار کس طرح ادا کرتی ہیں!

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" تم بہترین اُمّت ہو جو پُوری نوعِ انسانی کے لئے برپا کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ عالمِ انسانی کا "خیر" صرف دُنیائے اسلام ہی سے وابستہ ہے۔ یہاں پر "الناس" سے مراد پوری دُنیائے انسانیت ہے جس کی صلاح و فلاح کی ذمہ دار دُنیائے اسلام ہے۔ عالمِ انسانی کی موجودہ کج روی کو روکنا اور اس کو راہِ راست پر لانا بھی وقت کا سب سے بڑا تقاضا اور خلافتِ ارض کا ایک اہم ترین مقصد ہے۔ اہلِ اسلام کے پاس وہ "نورِ ہدایت" موجود ہے جس سے اس وقت دُنیا کے تمام مذاہب اور تمام قومیں تہی دامن ہیں۔

مگر اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے مادی اعتبار سے بھی اقوام عالم کی کچھ تو برابری ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ایک بہت بڑی نفسیاتی حقیقت ہے کہ دُنیا کی قومیں مادی علوم میں جس کو اپنا "امام" تسلیم کرلیتی ہیں، اُسی کو اپنے دیگر تمام معاملات میں بھی (چاہے وہ دینی قسم کے ہوں یا دنیوی) ذہنی اعتبار سے "منصبِ امامت" پر فائز سمجھنے لگ جاتی ہیں۔ جیساکہ آج علمی دنیا پر محض مادی علوم کی برتری کی بنا پر مُستشرقین کی ایک دھاک سی بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور ان کے "اقوال" کے مقابلے میں علمائے اسلام کی "باتوں" کو کوئی نہیں سنتا، یا انہیں کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اگرچہ مستشرقین کی باتیں کتنی ہی غلط اور علمائے اسلام کی باتیں کتنی ہی صحیح کیوں نہ ہوں۔ اگر مسلمان مادی علوم میں بھی برتر ہوتے تو یہ صورتِ حال کبھی رونما نہ ہوتی۔ لہٰذا ہمیں اس بنیادی علت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ بغداد اور مُسلم اسپین کے عروج کے دور میں مسلمانوں کی علمی برتری اور اُن کے وقار کا بھی یہی حال تھا جو آج ہم کو مغربی قوموں میں نظر آرہا ہے۔ جب تک موجودہ صورتِ حال معکوس نہ ہوگی ہم اقوام عالم کو "معروف" اور "منکر" کے اسباق پڑھا نہیں سکیں گے۔

دورِ جدید کا سب سے بڑا "منکر" تہذیبِ جدید کی وہ ہلاکت آفرینیاں اور مُہلک قسم کے سائنسی ایجادات ہیں جن سے عالم انسانی کو ہر حال میں بچانا ضروری ہے۔ اور یہ کارنامہ صرف عالم اسلام ہی انجام دے سکتا ہے جو نوعِ انسانی کا امین اور اُس کا محافظ بھی ہے، بشرطیکہ وہ اتنا طاقتور بن جائے کہ منشائے الٰہی کو بزور نافذ کرسکے۔ اس لحاظ سے "تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" کا صحیح تقاضا ہے کہ اس کے لئے کچھ مادی قوت بھی ہو۔ ورنہ یہ فریضہ خاطر خواہ طریقے سے انجام نہیں پاسکتا۔

اسلامی تہذیب اور تمدنِ جدید

تہذیب و تمدن کے بارے میں یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے کہ ہمیں صرف مغربی علوم سے اخذ و استفادہ کرنا ہے نہ کہ مغربی تہذیب کو اپنانا، جس کی ظاہری چمک دمک کی بنا پر اُس کے بعض حامی و شیدائی مُسلمانوں کو مغربی تہذیب اختیار کرلینے کا غلط مشورہ دیتے ہیں۔ مغرب سے جو چیز لینے کی ہے وہ صرف تمدنی علوم و فنون ہیں نہ کہ تہذیبی عناصر (اعتقادی اُمور اور طرزِ معاشرت وغیرہ۔) واقعہ یہ ہے کہ مغربی تہذیب اپنے دیوالیہ پن اور اخلاقی گراوٹ کی آخری حد تک پہنچ چکی ہے اور اس لحاظ سے

تہذیب کے معاملے میں وہ خود ہماری محتاج ہے۔ اب تبادلے کے اصول کے مطابق ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی تہذیب (اپنا مذہبی و اخلاقی سرمایہ) اُس کے حوالے کر کے اُس کے تمدنی علوم و فنون کے سرمائے کو خود لے لیں۔ اس میں نہ صرف دونوں کا بھلا ہے بلکہ اس میں دراصل انسانیت کی فلاح بھی مُضمر ہے۔

واضح رہے کہ یہ علوم و فنون دراصل اُس کے اپنے یا اُس کا ذاتی سرمایہ نہیں بلکہ درحقیقت ہمارے ہی آباء و اجداد کی وراثت ہیں جو مغربی قوموں کو خصوصیت کے ساتھ اسپین اور سسلی کی راہ سے ملے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے ان علوم و فنون کو بے انتہا ترقی دے دی ہے۔ مگر نیو اور بنیاد ہماری ہی ڈالی ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا مغربی علوم و فنون کو اپنانا مغربی اقوام کا زیرِ بارِ احسان ہونا نہیں بلکہ درحقیقت اپنی ہی امانت کو شکریہ کے ساتھ واپس لے لینا ہے۔

ایک دوسرے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ بھی ایک مُسلّم حقیقت نظر آئے گی کہ ہمارے آباء و اجداد نے قرونِ وُسطیٰ میں (بغداد، مصر، سسلی اور اسپین کے ادوار میں) مغربی قوموں کو علوم و فنون دے کر گویا کہ ان پر ایک احسان کیا تھا۔ اب ہم تہذیبی حیثیت سے بھی ان کی رہنمائی کر کے پھر دوبارہ ان پر احسان کرنے والے ہوں گے۔

اگر قرونِ وسطیٰ میں اقوامِ مغرب ہمارے علوم و فنون کے ساتھ ہی ساتھ ہماری تہذیب بھی لے چکی ہوتیں تو موجودہ مغربی تہذیب کی گراوٹ، انارکی اور خُدا فراموشی کا وہ حال نہ ہوتا جو آج نظر آ رہا ہے۔ بہرحال اسلامی تہذیب ہی ایک برتر تہذیب اور عالمِ انسانی کے لئے خیر و برکت کا باعث ہوگی جو اُدرخ پخ سے عالی اور ہر حیثیت سے صالح و متوازن ہے۔ جب تک اس تہذیب کا بول بالا نہیں ہوتا دُنیا سے سیاست و معیشت کی ہوسناکی و خود غرضی اور معاشرتی و اخلاقی تباہیوں کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔

خلافتِ ارض کے دو حصّے

اہلِ اسلام کو اپنی تہذیب پر پوری طرح ثابت قدم رہتے ہوئے صرف جدید علوم و فنون (تمدن جدید) سے مستفید ہونا ہے۔ ہماری تہذیب ایک چٹان کی طرح اٹل ہے جس کا ہم کو سودا نہیں کرنا ہے۔ بلکہ اس چٹان پر برقرار رہتے ہوئے ہم کو صرف تمدنِ جدید سے استفادہ کرنا ہے۔ تمدن ایک تغیر پذیر اور ارتقائی شے ہے جو

کسی بھی دور میں ایک حالت پر نہیں رہتا۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور تمدنِ جدید کے اجتماع ہی سے خلافتِ ارض کے تقاضے پورے ہوسکتے ہیں اور اسلام کی مطلوبہ نشأۃ ثانیہ برپا ہوسکتی ہے، جیساکہ پچھلے تمام مباحث اور اس سلسلے کی تمام آیاتِ قرآنی میں غور و خوض کے بعد واضح ہوتا ہے۔ تمدنِ جدید یا موجودہ صنعت و حرفت اور سائنس و ٹکنالوجی کو اپنانے کے باعث نہ صرف ہماری جہالت اور غربت و افلاس دُور ہوسکتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بے شمار معاشی، سیاسی، عسکری اور بین الاقوامی فوائد حاصل ہوسکتے ہیں بلکہ عالمی سطح پر ہمارا وقار اور مرتبہ بھی بلند ہوسکتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد ہم کو اپنی تہذیبی برتری کے اظہار کا موقع بھی ملے گا جو بہت ہی کارگر اور مؤثر ہوگا۔ اس طرح دُنیا اسلام کی برکتوں سے مالا مال ہوجائے گی جو کہ عنداللہ مطلوب و مقصود ہے۔

غرض اس اعتبار سے خلافتِ ارض اس وقت دو حصّوں میں بٹی ہوئی ہے: اس کا مادی حصّہ تو غیروں کے قبضے میں ہے اور اس کا صرف رُوحانی حصّہ اہلِ اسلام کے پاس ہے۔ جب تک یہ دونوں حصّے پھر سے یکجا نہیں ہوجاتے اسلامی نشأۃ ثانیہ ممکن نہیں ہوسکتی۔ اور جب تک یہ نشأۃ ثانیہ عمل میں نہ آئے موجودہ دُنیا اپنی تہذیبی و تمدنی ہلاکت خیزیوں کے مہیب غار سے کبھی نہیں نکل سکتی۔

موجودہ نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت

اس مقصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ہم پورے نصابِ تعلیم کا جائزہ لے کر اس میں مناسب تبدیلیاں کریں اور سائنسی علوم کی تحصیل پر زیادہ سے زیادہ زور دے کر ان کی تحصیل تیز سے تیز کردیں۔ اس سلسلے میں راقم سطور اپنے ناقص علم کے مطابق چند تجاویز پیش کرتا ہے:

۱۔ علمِ اسماء یا علمِ کائنات یا سائنسی علوم کی کماحقہ ترقی اور مُسلم معاشرے میں اس کی صحیح ترویج و اشاعت کے لئے ضروری ہے کہ جدید سے جدید تر تمام علوم مادری زبان میں پڑھائے جائیں۔ کاش کہ ہندوستان میں عثمانیہ یونیورسٹی کا "اُردو کردار" باقی رہتا جو اس برصغیر میں ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہا تھا اور جدید سے جدید تر تمام علوم و فنون کو اُردو میں منتقل کرنے کا عظیم الشان بیڑا اُٹھائے ہوئے تھا۔

۲۔ مُسلم ممالک میں تمام سرکاری و غیر سرکاری مدارس میں سائنسی علوم کی تعلیم لازمی قرار دی جائے۔
بلکہ ان علوم کی تحصیل کی ترغیب و تحریص دلائی جائے۔ اور ہر حال میں مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔

۳۔ ہمارے عربی مدارس میں خصوصیت کے ساتھ چند سائنسی علوم کو داخل کر کے نصابِ تعلیم کو زیادہ سے زیادہ عصری بنایا جائے۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ علم ایک مکمل وحدت ہے اور ہمارے علماء کو "مکمل علم" کا وارث بننا چاہیئے، نہ کہ آدھے علم کا۔ ورنہ موجودہ دور کی قیادت ممکن نہیں۔
"علم" ہمارا ایک قیمتی سرمایہ ہے، جس کی تقسیم کے باعث خوفناک نتائج رونما ہوئے، جو تاریخ کا ایک سیاہ باب بن چکے ہیں۔ جیساکہ ہمیں کلیسا (CHURCH) اور مادیت کی تاریخی کشمکش کے نتیجے میں دکھائی دیتا ہے۔ یہ تاریخ اب دوبارہ کبھی نہیں دہرائی جانی چاہیئے۔

۴۔ موجودہ عربی مدارس کے فارغین کے لئے اسلامی ممالک (خصوصاً پاکستان میں) کوئی دو سالہ کورس خاص کر جدید علوم کی تعلیم کے لئے قائم کیا جائے۔ اس کے بغیر ہمارے علماء کو جدید علوم کی ترویج و اشاعت کے باعث پیدا شدہ فکری، معاشرتی، تہذیبی اور تمدنی مسائل کو صحیح طور پر سمجھنا مشکل ہے۔ اور ان مسائل کو سمجھے بغیر پیش آمدہ مشکلات کا حل نکل نہیں سکتا۔

۵۔ سائنسی علوم کی تمام درسی و غیر درسی اہم اہم کتابوں کا اُردو اور دیگر مادری زبانوں میں ترجمہ کر کے مادری زبان میں ان علوم کی تعلیم و تدریس کو آسان سے آسان تر بنایا جائے۔

موجودہ تعلیمی نقائص

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ غیر ملکی زبانوں میں تعلیم دینے سے کسی فن کے مسائل دلوں میں راسخ نہیں ہوتے۔ کیونکہ زبان کی اجنبیت اس راہ میں ایک پردہ کے طور پر حائل رہتی ہے۔ طلبہ کے سامنے کوئی فن غیر مادری زبان میں پیش کرنا گویا ان کے سامنے بیک وقت دو چیزوں کو پیش کرنا ہے، ایک زبان اور دوسرے فن۔ اب وہ بیچارے حیران ہوتے ہیں کہ ان دونوں میں سے کس کو سمجھیں؟ زبان کو یا فن کو؟ یہ بالکل ایک غیر فطری اور عجیب سا طریقہ بلکہ ایک ظلم ہے کہ کمسن اور نوخیز ذہنوں پر اتنا بوجھ ڈال دیا جائے جس کے وہ متحمل نہ ہو سکیں۔ شاید اسی بنا پر اکثر طلبہ کا یہ مقصد ہو جاتا ہے کہ وہ بجائے

فن کو سمجھنے کے (جس کی اُن میں استعداد نہیں ہوتی) امتحانی سوالات کے جوابات رٹ کر کسی نہ کسی طرح امتحان میں کامیاب ہو جائیں۔ اس قسم کے "کامیاب" طلبہ آگے چل کر جب خود اساتذہ کے منصب پر فائز ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اپنی عدم قابلیت کی بنا پر اپنے ماتحت طلبہ میں کسی قسم کی قابلیت پیدا نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ سرکاری مدارس میں زیادہ تر یہ رواج سا ہو گیا ہے کہ کلاسوں میں بجائے لکچرز دینے اور فنی مسائل ذہن نشین کرانے کے (جن کی ان میں استعداد نہیں ہوتی) چند نوٹس لکھوا کر (جو پہلے سے تیار شدہ اور متوارث چلے آرہے ہوتے ہیں) پیچھا چھڑا لیا جاتا ہے۔ گویا کہ فرض ادا ہو گیا۔ اور طلبہ کا کمال یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان نوٹس کو رٹ کر امتحان میں لفظ بلفظ انھیں ایک طوطے کی طرح دُہرا دیں۔ اور یہ سلسلہ یونہیں نسل در نسل چلا آرہا ہے۔ اس فرسودہ نظام تعلیم میں اصلاح کا کسی کو خیال تک نہیں آتا۔

اس ناقص طرزِ تعلیم کی بدولت معیارِ تعلیم دن بدن گر رہا ہے اور ہمارے نونہالوں کی صلاحیتیں خواہ مخواہ ضائع ہو رہی ہیں۔ اور انہیں اُبھرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔ مشرقی ممالک خصوصاً ہند و پاک میں اچھے اور قابل سائنس دانوں کی کمی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ دُنیا کی کوئی بھی قوم علوم و فنون کی تعلیم غیر ملکی زبانوں میں نہیں دیتی۔ بلکہ درحقیقت اس کی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ اس نے اپنی قوم کے نونہالوں کی تعلیم اور ان کے ذہنی نشو و نما کے لئے اجنبی زبان کو ذریعہ تعلیم کبھی نہیں بنایا۔

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کس طرح برپا ہوگی؟

یہ خیال دل سے نکال دینا چاہیئے کہ مُسلم قوموں میں ایجاد و اختراع کا مادہ اور اُس کی صلاحیت نہیں ہے (جیسا کہ آج مغربی اقوام کا خاصہ دکھائی دیتا ہے)۔ بلکہ اصل میں یہ ہمارے موجودہ نظام تعلیم کی خرابی ہے۔ ورنہ آج بھی ہماری ملت میں جابر بن حیان (جدید علمِ کیمیا کا بانی) محمد بن موسیٰ خوارزمی (ریاضی اور فلکیات کا زبردست ماہر)، محمد بن زکریا رازی (ایک بے مثال طبیب و محقق)، ابنِ ہیثم (علمِ بصریات کا ماہر و مُوجد) ابنِ سینا (بہت بڑا طبیب و مصنف)، البیرونی (ایک نابغہ اور یکتائے روزگار سائنس دان) ابنِ نفیس (کاشفِ دورانِ خون)، ابو حنیفہ دینوری (دنیا کا پہلا محقق نباتات)،

عمر خیام (ریاضی و ہیئت کا ماہر) اور ابوالقاسم الزاہراوی (جدید علم سرجری کا باوا آدم) جیسے زبردست اور نامور سائنس داں، محققین و موجدین پیدا ہوسکتے ہیں۔

بطور مثال یہاں پر صرف چند نام گنائے گئے ہیں۔ ورنہ اگر پوری طرح چھان بین کی جائے تو ہمارے علماء، حکماء، محققین اور موجدین کی ایک بہت بڑی فہرست تیار ہوسکتی ہے، جن کے کارناموں کی تفصیل کے لئے ایک ضخیم جلد درکار ہوگی۔

علوم و فنون کے باب میں ہمیں جاپانی قوم سے سبق سیکھنا چاہئے، جس نے دوسری جنگِ عظیم میں اپنا سب کچھ برباد کردینے کے باوجود ہمت نہیں ہاری، بلکہ تن من دھن کی بازی لگا کر صرف رُبع صدی میں نہ صرف دُنیا کے صفِ اول کے صنعتی ممالک میں شامل ہوگئی بلکہ بہت سے ترقی یافتہ ممالک کو بھی پیچھے چھوڑ گئی۔ یہ معجزہ آخر کس طرح ظہور میں آیا؟ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ مسلسل محنت، جفاکشی اور مقصد سے لگن کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

اس مقالے کو ختم کرنے سے پہلے ہمارے علماء کے منصب پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا جدید علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے ہمیشہ معاشرہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن کو سلجھانے اور فکری حیثیت سے معاشرے کی رہنمائی کرنے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔ مثلاً اب سے چند سال پہلے جب پہلی مرتبہ امریکی خلا بازوں کے ذریعہ چاند کی تسخیر عمل میں آئی تھی تو اس وقت خیالات کی دُنیا میں زبردست انتشار برپا ہوگیا اور طرح طرح کے فکری و اعتقادی سوالات پیدا ہوگئے۔ اسی طرح آج کل "ٹیسٹ ٹیوب بے بی" کے مظاہرہ سے پیدا ہونے والے فقہی مسائل علمی حلقوں کے سامنے سوالیہ نشان پیدا کر رہے ہیں۔ یعنی اس عمل کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے نسلی، نسبی اور وراثتی سوالات اور پیچیدگیاں۔

اس طرح آج دُنیائے اسلام کو بہت سارے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا سامنا ہے؛ جن کا حل تلاش کرنے کے لئے متعلقہ علوم اور اُن کے مسائل کی گہرائیوں میں جانے کے ساتھ ساتھ دینِ ابدی کے "نصوص" میں بھی گہری بصیرت حاصل کرنی ضروری ہے۔ اس طرح ان دونوں علوم

کے مسائل و مباحث میں غور و فکر اور ان کے موازنہ و مقابلہ کے بعد ہی کوئی مفید اور تسلی بخش حل نکل سکتا ہے۔

اس اعتبار سے ہمارے علماء کو جدید علوم و مسائل سے بھی آگاہ رہنا چاہیئے تاکہ وہ مثبت طور پر نہ صرف مسلم معاشرے کی بلکہ عالم انسانی کی بھی رہنمائی احسن طور پر کر کے خلافتِ ارض کے منصبِ عظیم سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ ان بنیادی اقدامات کے بغیر کوئی ہمہ گیر ذہنی و فکری انقلاب لانا مشکل ہے۔ اور اس قسم کے ذہنی و فکری انقلاب کے بغیر عالمِ انسانی کی مکمل اصلاح کبھی نہیں ہو سکتی۔

خلاصہ بحث یہ کہ آج ہم کو بیک وقت دو میدانوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے:

۱۔ ہر ممکن طریقے سے سائنسی علوم کو ترقی دے کر صنعت اور ٹکنالوجی کے میدان میں مُسلم معاشرہ کو آگے بڑھانا اور انہیں صفِ اول کی قوموں میں لا کر کھڑا کرنا۔

۲۔ سائنسی علوم کی ترقی اور ان کی ترویج و اشاعت سے پیدا ہونے والے فکری، معاشرتی اور تمدنی مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنا۔

پہلا فریضہ ماہرینِ سائنس پر عائد ہوتا ہے اور دوسرا فریضہ علمائے اسلام پر۔ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے خلافتِ ارض کا مکمل حصول ضروری ہے۔ اور خلافتِ ارض بغیر علمِ اسماء اور تسخیرِ اشیاء میں برتری کے کبھی مکمل نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم کو اسلام کی نشأۃ ثانیہ یا اُس کے دوبارہ غلبے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دینی چاہیئے۔ اور کوشش کرنی چاہیئے کہ پندرھویں صدی ہجری اپنی سرتوڑ جد و جہد کے ذریعہ اسلام کی صدی بنا دیں۔ وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

۲- اسلام اور جدید سائنس

مقصد اور طریقۂ کار

اسلام کی آفاقیت

اسلام دنیا کے دوسرے مذاہب کی طرح کوئی مُردہ مذہب یا عارضی دین نہیں بلکہ قیامت تک باقی و برقرار رہنے والا ایک زندہ اور لازوال مذہب ہے۔ اسلام کے سوا دنیا کے کسی بھی مذہب نے نفیاً یا اِثباتاً اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ اس کا پیغام پوری نوعِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کے لئے کافی و شافی، جامع و مکمل، عالمگیر و آفاقی اور دائمی و ابدی ہے۔ اسلام صاف اور کھلے ہوئے الفاظ میں یہ دعویٰ بھی کرتا ہے کہ اِس پُوری کائنات میں وہی ایک سچا، برحق اور ہمیشہ باقی رہنے والا مذہب ہے جو دلیل وحجّت کے ذریعہ نہ صرف تمام ادیانِ عالم پر غالب رہے گا، بلکہ قیامت تک ہر زمانے کی عقلیت اور اُس کے علمی تصوّرات و نظریات پر بھی بھاری رہے گا، خواہ وہ سائنس ہو یا فلسفہ، حکمت و دانش ہو یا کسی قسم کا خود ساختہ "اِزم"۔

اسلام کے دعوے

آگے بڑھنے سے پہلے اسلام کے بارے میں چند بنیادی تصورات کو سمجھ لیا جائے۔ جو اُس نے اپنے بارے میں کئے ہیں:

۱- وہ اپنے آپ کو پوری نوعِ انسانی کا ہادی و رہبر قرار دیتا ہے:

هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانُ : یہ قرآن نوعِ انسانی کے لئے ہدایت نامہ ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل میں تمیز کے دلائل موجود ہیں۔ (بقرہ : ۱۸۵)

دوسری جگہ ارشاد ہے :

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ : یہ تو سارے جہاں کے لئے ایک درس ہے ۔ (ص : ۸۷)

۲۔ وہ ایک مکمل دین و مذہب ہے :۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا : آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو بحیثیت ایک دین کے پسند کیا ۔ (مائدہ : ۳)

۳۔ اس کا سرکاری صحیفہ (قرآن) نوعِ انسانی کے لئے ایک جامع اور کافی و شافی صحیفہ ہے :۔

اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ : کیا ان لوگوں کے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر ایسی کتاب اُتار دی ہے جو اُنہیں پڑھ کر سُنائی جاتی ہے ۔ یقیناً اس میں ایمان لانے والوں کے لئے رحمت و بصیرت موجود ہے ۔ (عنکبوت : ۵۱)

۴۔ صرف وہی دائمی مذہب ہے ۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام ادیان اپنے اپنے زمانے کے لئے تھے جن کی ضرورت اسلام کے بعد باقی نہیں رہی :

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ : اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین چاہے گا تو وہ غیر مقبول ہوگا اور وہ آخرت میں ناکام رہے گا ۔ (آل عمران : ۸۵)

۵۔ دلیل و حجت کے ذریعہ تمام ادیان پر غالب رہے گا اور کوئی مذہب علمی و عقلی حیثیت سے اُس کا مقابلہ نہ کر سکے گا :

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ : وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور

دینِ حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اس کو تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکین اس کو ناپسند ہی کیوں نہ کریں۔
(صف : ۹)

اسلام کی خود کفیلی

یہ اسلام کے وہ بنیادی تصورات ہیں جن کا دعویٰ دنیا میں اسلام کے سوا آج تک کسی مذہب نے نہیں کیا، اُس کی ساری تعلیمات ان ہی بنیادوں پر مبنی ہیں۔ یہ تعلیمات خواہ عقائد سے متعلق ہوں یا عبادات سے، تہذیبِ نفس سے تعلق رکھتی ہوں یا معاشرت و سیاست سے، کسی محدود قومی تصوّر یا جغرافیائی وفاداریوں پر مبنی نہیں بلکہ وسیع آفاقی بنیادوں پر استوار کی گئی ہیں، جو اس کے عالمگیر اور بین الاقوامی مذہب ہونے کی دلیلِ ناطق ہے۔

اسلام ہر لحاظ سے ایک مکمل اور خود کفیل مذہب ہے۔ وہ اپنی کسی چیز میں کسی دوسرے نظام کا محتاج نہیں جس پر مسلمانوں کا چودہ سو سالہ دورِ حکومت شاہد ہے۔ چنانچہ ان کو اپنے کسی معاشرتی، ملکی، سیاسی اور تمدّنی معاملہ میں دوسری اقوام سے قوانین مستعار لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی، جس طرح عیسائیوں کو اپنے دورِ حکومت میں اپنے مذہب کی تنگ دامانی کی بناء پر رومیوں کے قوانین (ROMAN LAW) سے استفادہ کرنا پڑا تھا۔ اس سے ایک اُمّی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے لائے ہوئے دینِ متین کے حیرت انگیز اعجاز کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسلام کا انقلابی نظریہ

اسلام کا بنیادی مقصد روح کا تزکیہ و تطہیر، انسانی افکار و تصورات کی تہذیب، غلط نظریات و مفروضات کی تنقیح، خدا اور بندے کے درمیان صحیح تعلق کی استواری، حقوق العباد کا تحفظ، اخلاقی خصائل کا احیاء، جبر و استبداد کا استیصال، کائنات میں پھیلی ہوئی گمراہیوں کا خاتمہ، عالمگیر اور بین الاقوامی امن و امان، ایک صالح، پاکیزہ اور مثالی معاشرۂ انسانی کا قیام ہے، جس میں تمام افرادِ انسانی کے یکساں حقوق و فرائض ہوں اور ادنیٰ و اعلیٰ کا فرق مٹ جائے اور سب کے سب صحیح معنوں میں خدا کے بندے بن کر کارزارِ حیات میں ایک دوسرے کے دوش بدوش مصروفِ عمل ہو جائیں۔

مگر یہ ہمہ گیر معاشرتی و تہذیبی انقلاب اس وقت تک برپا نہیں ہو سکتا تھا، جب تک ایک

فکری و نظریاتی انقلاب برپا نہ کیا جائے۔ اس کے لئے اس نے عالمِ انسانی کی ذہنی دُھلائی کی اور اُس کے دل و دماغ میں چند بنیادی تصورات و اعتقادات کو راسخ کر کے خود ساختہ تخیلات و مفروضات کی تاریکی سے باہر نکالا اور اس کے دل و دماغ میں خُدا پرستی کا صحیح تصور قائم کیا۔ اس کے یہ بنیادی عقائد حسبِ ذیل ہیں :

اسلام کے بنیادی عقائد

(۱) انسان اس دنیا میں ایک آزاد و بے مہار ہستی یا ڈارون (DARWIN) کے نظریۂ ارتقا (EVOLUTION) کے مطابق کوئی "بڑھیا جانور" نہیں ہے کہ جرجی میں آئے کر ڈالے، بلکہ ایک ذمہ دار اور جوابدہ ہستی ہے، قرآن نے اس ذمہ داری اور جوابدہی کی تعبیر "خلافت" کے لفظ سے کی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَيْهِ كُفْرُهٗ : وہی ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ پس (اب) جو کوئی (اس خلافتِ ارضی) سے انکار کرے گا تو اُس کے انکار کا وبال اُسی پر ہو گا۔ (فاطر : ۳۹)

(۲) یہ کائنات خود بخود وجود میں نہیں آئی، بلکہ ایک زبردست قدرت والی علیم و خبیر ہستی نے ایک اٹکیم اور منصوبہ بندی کے تحت اس کی تخلیق کی ہے :

✓ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ :

اللہ نے زمین و آسمان کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس میں ایمان والوں کے لئے ایک نشانی ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)

(۳) یہی خلّاق ہستی اس کائنات کی ناظم، مدبّر، مالک اور حاکم ہے، اور تمام مظاہرِ فطرت اس کے قبضہ اور تصرف میں ہیں۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں خُدا کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس ناظم و مدبّر کو ربّ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، جس کا ناقص مفہوم اُردو زبان میں مُربّی اور انگریزی میں LORD کے لفظ سے ادا ہو سکتا ہے۔

(۴) اس نے یہ پورا کارخانۂ عالم نظم وضبط اور حکمت ومصلحت کے ساتھ پیدا کیا ہے، جو ایک دن اُجڑ جائے گا' اور تمام انسانوں کو دوبارہ زندہ کر کے ان کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے گا' اور ہر ایک کو اس کے اچھے بُرے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اسلامی اصطلاح میں اس عظیم دن کو قیامت کا دن کہتے ہیں۔

(۵) چونکہ انسان کو اس دُنیا میں مُکلّف اور ذمہ دار (RESPONSIBLE) قرار دیا گیا ہے، اس لئے اس کی ہدایت و رہبری کے لئے نبوّت و رسالت کا سلسلہ جاری کیا گیا، جس کے ذریعہ اللہ کے احکام و مرضیات اس کے بندوں تک پہنچائے جائیں۔

(۶) اسلام — بلکہ بنیادی طور پر تمام انبیائے کرام کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات میں صرف ایک ہی رب (مُربّی یا LORD) ہے جو ساری مخلوقات کی ضروریات کا کفیل اور ان کے اعمال و افعال کا نگران ہے، اس کے سوا کوئی دوسری ہستی اس کی ربوبیت میں شریک و سہیم نہیں ہے۔ اس لئے اسلام کا یہ مطالبہ بالکل فطری اور منطقی ہے کہ جب سارے جہاں کا رب ایک ہے تو سارے جہاں کا اِلٰہ (معبود و مسجود) بھی ایک ہی ہونا چاہیئے۔ جب ربوبیت میں اس کا کوئی شریک و ساجھی نہیں ہے تو پھر اُلوہیت میں بھی اُس کا کوئی حصہ دار نہ ہونا چاہیئے۔ قرآنِ کریم کی ساری تعلیمات کی بنیادی روح یہی ہے۔

اسلام کے ان بنیادی تصورات کو مختصر طور پر توحید، رسالت اور معاد (یوم جزا) کے تصورات کہہ سکتے ہیں۔ یہ دینِ متین کے تین بنیادی ستون ہیں جن پر اس کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

اسلام کا کارنامہ

ان بنیادی اور اہم ترین عقائد کو تسلیم کئے بغیر نہ عالمِ انسانی کی اصلاح ہو سکتی ہے اور نہ اس میں کوئی ہمہ گیر انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اسلام نے سب سے پہلے ان ہی عقائد کی تنقیح کی ہے۔ مگر وہ دوسرے مذاہب کی طرح اپنے عقائد کو جبر و تحکّم سے نہیں منواتا بلکہ اس کی حکیمانہ تشریح کرتا اور ان کو علمی و عقلی اور آفاقی و انفسی دلائل و بیّنات کی روشنی میں سمجھاتا ہے اور کسی اُلجھن، تشکیک، فکری انتشار اور لاادریت (AGNOSTICISM) کی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا۔ اسلام کے یہ دلائل حد درجہ علمی، سائنٹفک اور ہر زمانے کی ذہنیت کے مطابق قطعی مُسکت اور فیصلہ کُن ہیں، جس کا کوئی ادنیٰ تصوّر

بھی ہمیں موجودہ تورات (OLD TESTAMENT) یا موجودہ انجیل (NEW TESTAMENT) میں نہیں ملتا۔ ان صحیفوں میں علمی و عقلی دلائل اور آفاقی و انفسی (SCIENTIFIC) شواہد کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ دلائل و شواہد تو بعد کی چیزیں ہیں، ان میں بنیادی عقائد ہی کا کوئی جامع و واضح تصور نہیں ملتا۔ اس لئے یہ صحیفے آوٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں اور ان میں موجودہ حالات کے مقابلہ اور عصرِ حاضر کی ذہنیت کے مطابق انسان کی علمی و فکری اصلاح اور ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

اس کے مقابلہ میں اسلام ایک دائمی اور بین الاقوامی مذہب ہے، اس لئے اس کے صحیفے میں قیامت تک ہر زمانے کی ذہنیت اور اس کی ضروریات کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے، تاکہ وہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کر سکے اور خدا پرستی اور انسانیت کی اقدار کا احیاء اور باطل و ظلم و عدوان کا ابطال کرتا رہے اور پورا عالمِ انسانی ایک معاشرہ اور ایک خاندان بن جائے جس میں اولادِ آدم امن و امان اور سکون و طمانیت کی زندگی بسر کر سکیں۔

کائنات اور اسلام

اس زندہ مذہب کی زندہ کتاب میں کائنات کے حقائق (رازہائے فطرت) سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ پہلا اور آخری مذہب اور آسمانی صحیفوں میں قرآن ہی وہ واحد صحیفہ ہے جو انسان کو کائنات اور اُس کے نظام (نیچر) میں غور و فکر کے ذریعہ عبرت و بصیرت حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اپنے پیش کردہ عقائد و تعلیمات کی حقانیت کے اثبات کے لئے کائنات اور اُس کے نظام کو بطورِ دلیل پیش کرتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پوری کائنات ایک عظیم حکمت و مصلحت اور کامل منصوبہ کے تحت پیدا کی گئی ہے۔ محض بخت و اتفاق کے طور پر ظہور پذیر نہیں ہو گئی اور آج سے چودہ سو سال پہلے اس منصوبہ بندی کے تمام بنیادی اُصولوں کو قرآن مجید میں لکھا جا چکا ہے، جب کہ ان نظریات و تصورات کا دُنیا میں کوئی وجود نہیں تھا۔ اور آج بیسویں صدی میں یہ منصوبہ قرآن کی صداقت کو جانچنے کا نہایت آسان طریقہ ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سائنس ہر چیز کی صحت و صداقت جانچنے کا معیار ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسلامی عقائد اس قدر فطری اور مطابقِ واقعہ ہیں کہ

ان کی تصدیق قانونِ فطرت میں بھی موجود ہے اور جیسے جیسے سائنسی تحقیقات آگے بڑھتی جائیں گی عقائدِ اسلامی کی حقانیت بھی واضح ہوتی چلی جائے گی۔ اس لئے اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

کائنات اور دیگر مذاہب

اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ مسئلہ آتا ہے کہ اس خارجی دُنیا اور اس وسیع و عریض کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ مختلف مذاہب اور دانشوروں نے اس سوال کے مختلف جوابات دیئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ کائنات مختلف دیوتاؤں کی شوریدہ سری اور رزم آرائیوں کا نتیجہ ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا میں خیروشر کی الگ الگ حکومتیں قائم ہیں اور ہر طرف دوئی ہی دوئی (ثنویت یا DUALISM) نظر آتی ہے۔ کسی کا خیال ہے کہ یہ کائنات محض بخت و اتفاق سے وجود میں آگئی ہے، اس کا خالق و ناظم نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ کسی کا دعویٰ ہے کہ جدید سائنٹفک حقائق نے دین و مذہب کی چولیں ہلا دیں، اور موجودہ دُنیا میں خُدا اور مذہب کی کوئی جگہ نہیں رہ گئی ہے۔

اس قسم کے لادینی نظریات زیادہ تر عیسائی علماء کی کوتاہ بینی کا نتیجہ ہیں۔ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا (CHURCH) والوں نے ارسطو اور بطلیموس وغیرہ یونانی حکماء کے بعض نظریات و مفروضات کو عیسائیت اور بائبل کے مسلّمہ عقائد (سرکاری معتقدات) قرار دے دیا اور کائنات کے نئے اکتشافات کا انکار اور تجربہ و مشاہدہ کی تکذیب کی جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے۔ اہلِ کلیسا کی اسی غلط روش کا ردِّ عمل مادیت (MATERIALISM) یا فطرت پرستی (NATURALISM) کی شکل میں ظاہر ہُوا جس کے سنگین نتائج سے آج پورا عالمِ انسانی دوچار ہے۔

سائنس اور قرآن

لیکن اسلام کے نزدیک یہ پوری کائنات ایک ہمہ گیر اسکیم اور منصوبہ بند نظام کا نتیجہ ہے اور اس کے ذرہ ذرہ میں اربابِ بصیرت کے لئے خدا کے وجود، اس کی وحدت و یکتائی، قدرت و ربوبیت اور حکمت و مصلحت کے ناقابلِ انکار دلائل اور نشانیاں موجود ہیں:

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ

الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ :

زمین و آسمانوں کی تخلیق میں، دن رات کے ہیر پھیر میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے مفاد کی خاطر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں جس کو اللہ (سمندروں سے بخارات کی شکل میں نکال کر) ایک خاص بلندی سے برسا دیتا ہے، پھر اس پانی کے ذریعہ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے (جس کے باعث وہ لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں تبدیل ہو جاتی ہے)۔ ان تمام جانداروں میں جن کو اس نے اس طرح کے سینے پر پھیلا دیا ہے۔ ہواؤں کے (نظام) ادل بدل میں اور اس بادل میں (جو بغیر کسی سہارے کے ایک خاص بلندی پر) زمین و آسمان کے درمیان ٹھہرایا ہوا ہے۔ (غرض ان تمام مظاہرِ فطرت میں) عقل و دانش والوں کے لئے (اللہ کی توحید اور اس کی قدرت و ربوبیت کے بے شمار) نشانات و دلائل موجود ہیں۔ (بقرہ : ۱۶۴)

اس قسم کی آیتیں قرآن حکیم میں بکثرت ہیں، جن میں اسلوب بدل بدل کر انسان کو نظامِ کائنات میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسلام سائنسی تحقیقات کو دین و مذہب کے خلاف تصور نہیں کرتا۔ ورنہ اس قسم کی ہدایات کبھی نہ دیتا) اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ قرآن کریم کی کل آیات ۶۶۱۶ ہیں جن میں احکام سے متعلق پانچ سو آیات ہیں۔ (الاتقان فی علوم القرآن)۔ اور نظامِ کائنات یا متعلقاتِ سائنس پر ساڑھے سات سو آیات ہیں۔ (القرآن والعلوم العصریۃ)۔ امام الائمہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآنی علوم کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ (۱) علمِ احکام (۲) علمِ مناظرہ (۳) علمِ آلاء اللہ (۴) علم ایام اللہ (۵) اور علمِ آخرت۔ (الفوز الکبیر) یہ ایک اصولی اور فلسفیانہ تقسیم ہے۔ ہم "علم آلاء اللہ" کو موجودہ زبان میں علمِ کائنات یا علمِ سائنس کہہ سکتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کے نزدیک علومِ کائنات کی کتنی اہمیت ہے۔

سائنس اور مسلمان

یہ ان ہی آیات کا نتیجہ تھا کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمانوں نے کائنات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش کی طرف توجہ کی، جس کی بدولت موجودہ سائنس کی بنیاد پڑی اور مسلمان سائنس دانوں نے جغرافیہ، ریاضی، طبیعیات، کیمیا، حیاتیات، فلکیات اور طب وغیرہ میں شاندار کارنامے انجام دیئے۔ اور دُنیا کو نئے نئے علوم وفنون سے آشنا کیا۔ اُس دور کے مشہور سائنس دانوں میں جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابنِ ہیثم، بوعلی سینا، ابوریحان البیرونی، ابنِ نفیس، اور ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، جن کی بلند پایہ تحقیقات اور شہرۂ آفاق تصنیفات پر جدید سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔

قرونِ وسطیٰ میں جب نئے نئے علوم و فنون کی اشاعت ہوئی تو اس سے نئے نئے علمی مسائل اٹھ کھڑے ہوئے جنھیں سلجھانے اور علمی دنیا کی رہنمائی کرنے کے لئے علماء کا ایک طبقہ میدان میں آیا۔ ان میں سب سے مشہور امام غزالیؒ، امام رازیؒ، اور امام ابنِ تیمیہؒ وغیرہ ہیں۔ ان علماء اور مفکرین نے اپنے دور کے "علومِ جدیدہ" میں غور و خوض کر کے اپنے دور کی ذہنیت کے مطابق علمی و سائنٹفک دلائل کی تدوین کی، جن کو قرآن کی اصطلاح کے مطابق "آیات اللہ" (خدائی نشانات و دلائل) کہا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک نمایاں اور شاندار مثال تفسیرِ کبیر ہے۔

اس طرح مسلمانوں میں شروع ہی سے دو گروہ رہے ہیں، ایک کائنات اور علومِ کائنات کی چھان بین میں لگا رہا اور دوسرا آیات اللہ کی تحقیق و تفتیش میں۔ اس بارے میں مسلمانوں کا فکر و نظر ہمیشہ صاف، سیدھا اور متوازن رہا اور فلسفہ کے برعکس کسی مسلمان فرقے نے سائنس یا علومِ کائنات کو کبھی مذہب کے خلاف نہیں سمجھا بلکہ اس دور میں سائنس ہمیشہ مذہب کے تابع رہی اور ایک دوسرے کے تعارض و تضاد کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہو سکا، جس طرح کہ عصرِ حاضر میں بعض لوگوں کو سائنسی تحقیقات اور مذہبی تعلیمات میں تصادم اور ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر ڈریپر کی کتاب ملاحظہ ہو جو معرکۂ مذہب و سائنس (CONFLICT BETWEEN RELIGION AND SCIENCE) کے نام سے مشہور ہے۔ ظاہر ہے

کہ یہ اسلام کی صحیح رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کی ترقی دراصل اسلام ہی کی مثبت اور انقلابی دعوتِ فکر کا نتیجہ ہے۔

مادّیت اور اسلام

مگر یہ دنیا کی بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ جب علم وفن کی باگ مسلم حکومتوں کے زوال کے ساتھ مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھن گئی اور پندرھویں صدی کے بعد علم و دانش کی شمع مغربی ممالک میں روشن ہوئی تو اہلِ کلیسا کی نااہلی کی بناء پر سائنس اور مذہب میں ٹکراؤ پیدا ہو گیا۔ اگرچہ یہ ٹکراؤ مصنوعی اور غیر حقیقی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ ان ہی غلط نظریات و تخیلات نے آج ایک عالمگیر تصادم کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اور آج دُنیا میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں ہے، جو ان غلط نظریات و اوہام کی تردید کر کے علمی و عقلی اور سائنٹفک انداز میں مادّیت و نیچریت اور الحاد و دہریت کا مقابلہ کر سکے۔

خود ساختہ عقائد کی مذمّت

جیسا کہ اُوپر گذر چکا، اسلام پوری کائنات کو اپنے دعوے کی دلیل اور اپنے عقائد و تعلیمات کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ اس سے اس کے دعوے کی صحت و صداقت عین الیقین اور حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے وہ علوم کائنات کی ترقی کا اولین داعی اور نقیب ہے۔ اور ان لوگوں کو جو صحیح عقل و فکر سے کام نہیں لیتے اور آنکھیں بند کر کے پُرانی روایات اور رسوم پر عمل کرتے ہیں چوپایوں سے تشبیہ دیتا ہے:

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِىْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَىْءٍ وَّ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ:

کیا انہوں نے زمین و آسمانوں کی بادشاہت اور مخلوقاتِ الٰہی کو بغور نہیں دیکھا؟ بہت ممکن ہے کہ (ان کی اس بے حسی اور بے بصیری کی بناء پر) اُن کا وقت قریب آ گیا ہو تو اب (اس واضح اور سائنٹفک طریقے کے) بعد آخر وہ کس چیز پر اور کس طرح ایمان لا سکیں گے؟ (اعراف: ۱۸۵)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ

لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ :

اور ہم نے جہنّم کو (بھرنے) کے لئے بہت سے ایسے جنّوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے جو دل رکھنے کے باوجود سمجھتے نہیں اور کان ہونے کے باوجود سنتے نہیں، یہ لوگ چوپایوں جیسے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ گئے گذرے۔ (اعراف : ۱۷۹)

وجودِ باری

ان وضاحتوں کے بعد اسلام کے بعض بنیادی عقائد و تصورات پر جدید سائنس کی روشنی میں نظر ڈالی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اثباتِ باری تعالیٰ کے مسئلہ کو لیجئے، قرآن کہتا ہے :

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ :

اور اُس کے نشاناتِ (وجود و قدرت) میں سے ہے یہ بات کہ اس نے زمین و آسمانوں کو پیدا کیا اور ان دونوں میں (ہر قسم کے) جاندار پھیلا دئے۔ (شوریٰ : ۲۹)

اس آیت میں " دابّة " (جاندار ہستی) کے وجود کو خدا کے وجود کی دلیل قرار دیا گیا ہے۔ جدید سائنس بھی طویل تحقیق و تجربہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ تمام حیوانات و نباتات کی تخلیق نخرمایہ (PROTOPLASM) سے ہوئی ہے جن کے کیمیائی (CHEMICAL) اجزا آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن، نائٹروجن، فاسفورس، سلفر، کلورین، کیلشیم، سوڈیم اور میگنیشیم وغیرہ بھی دریافت کر لئے گئے ہیں، مگر انتہائی کوشش کے باوجود پوری دُنیائے سائنس کو ان کیمیائی اجزا و عناصر (ELEMENTS) کو باہم ملا کر پروٹوپلازم بنا لینے میں کامیابی نہ ہو سکی، وہ ان اجزا و عناصر کو لاکھ طرح سے ملاتی ہے، مگر وہ پروٹوپلازم نہیں بنتا[1] ایک سائنس دان نے پورے پندرہ سال تک ان عناصر کو

---

[1] حیوانات و نباتات کے اجسام نہایت درجہ ننھے ننھے خانوں پر مشتمل ہوتے ہیں، جن کو خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان خوردبینی خانوں کو " خلیے " (CELLS) کہتے ہیں۔ ان ہی خلیوں میں پروٹوپلازم (جیلی نما لچکدار اور زندہ و متحرک مادّہ) بھرا رہتا ہے۔ اور ہر دو خانوں کے درمیان ایک پتلی دیوار حائل رہتی ہے۔ اس لحاظ سے ہر خانہ زندگی کی ایک اکائی (UNIT) یا بنیادی اینٹ ہے۔

ہر ہر طرح سے ترکیب دینے کی کوشش کی، مگر اس میں "زندگی" کی کوئی رمق بھی نمودار نہ ہوئی۔ اس سے مادّیت و دہریت کا یہ دعویٰ باطل ہو جاتا ہے کہ زندگی کا ظہور بغیر کسی خالق (CREATOR) کے خود بخود ہو گیا ہے۔ اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس عالم ہست و بود میں ایک با ارادہ و اختیار ہستی کی کارفرمائی جاری و ساری ہے۔ جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ : وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اس سے چارلس ڈارون اور اس کے ہمنواؤں کا نظریۂ ارتقا (EVOLUTION) بھی مردود قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب بغیر کسی خالق و فاعل کے یک خلوی (UNICELLULAR) جاندار ہی کا وجود ممکن نہیں، تو پھر پیچیدہ انواع (MULTICELLULAR SPECIES) کا وجود بغیر کسی خالق کے کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

اثباتِ قیامت

یہ قرآنِ کریم کے بے شمار آفاقی دلائل (وہ سائنٹفک شواہد جو اس کارخانۂ فطرت میں انسان کے چاروں طرف بکھرے ہوئے ہیں) میں سے صرف ایک دلیل ہے۔

اس سے قرآن کریم کے علمی و سائنٹفک دلائل کی نوعیت و اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اب کائنات کے اختتام یا اثباتِ قیامت پر بھی ایک سائنٹفک دلیل ملاحظہ ہو۔ قرآن کہتا ہے:

إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ :

جب سورج لپیٹ دیا جائے گا اور جب ستارے پراگندہ ہو جائیں گے۔ (تکویر: ۱-۲)

اس مقام پر سورج کو یوم جزا کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے، اور جدید سائنس قرآنِ عظیم کے اس دعوے کی صداقت پر بھی مہرِ تصدیق ثبت کر چکی ہے۔ چنانچہ سائنس دان طویل غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ سورج اور دوسرے ستاروں میں جو روشنی اور حرارت پائی جاتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ تمام اجرام ہائیڈروجن گیس کے بنے ہوئے ہیں۔ سورج کے بطن میں تقریباً دو کروڑ ڈگری حرارت پائی جاتی ہے۔ اس زبردست حرارت و تپش میں ہائیڈروجن عمل فیوژن (ایک ایٹمی

عمل) کے طور پر جل کر مسلسل ہیلیم گیس میں تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ اور ایک دن ایسا ضرور آنے والا ہے جب اس کی ساری ہائیڈروجن ختم ہو جائے گی اور وہ ایک سرد و بے جان جسم کی طرح ایک طرف لڑھک جائے گا۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف ایک سکنڈ میں سورج کے وزن میں دو ملین ٹن (فی یوم پونے دو کھرب ٹن) کی کمی واقع ہو رہی ہے۔ اگرچہ سورج ہماری زمین سے بارہ لاکھ اسی ہزار گنا بڑا ہے، مگر ایک نہ ایک دن اس کا سارا ایٹمی ایندھن (FUEL) اور توانائی (ENERGY) ختم ہونا لازمی ہے۔ تفصیل کے لئے امریکی سائنس دان جارج گیمو کی کتاب سورج کی پیدائش اور موت (THE BIRTH AND DEATH OF THE SUN) ملاحظہ ہو۔ غرض سورج کا اختتام کائنات کے اختتام کا دیباچہ ہے، جس کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بہت پہلے کہہ چکا ہے: إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ وَإِذَا النُّجُومُ انكَدَرَتْ۔

اثباتِ رسالت

ان مثالوں سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ اس عالم رنگ و بو میں ایک علیم و خبیر ہستی کا وجود ہے، اور قرآن کسی انسان کا تراشیدہ کلام نہیں ہے، ورنہ وہ اس قدر لازوال سچائیوں سے لبریز نہ ہوتا۔ مغربی علماء و فضلاء ظہورِ اسلام کے زمانے کو "تاریک دور" (DARK AGES) سے تعبیر کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تاریک دور میں بغیر وحی الٰہی کے اور بغیر ایک ہمہ دان و ہمہ بین ہستی کی رہنمائی کے رسمی علوم سے ناواقف اُمّی[1] (فداہ ابی و امی) نے اس قدر صحیح، یقینی اور بے خطا طور پر سائنٹفک حقائق اور اسرارِ کائنات کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کیسے اور کیونکر کردی؟ کیا اس قسم کی کوئی دوسری مثال پورے انسانی لٹریچر میں موجود ہے؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے سچے رسول تھے، اور اسلام ایک سچا اور برحق مذہب ہے، جس کی صداقت روز بروز عیاں ہوتی جارہی ہے، جیسا کہ کلام مجید کا ارشاد ہے:

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ

---

[1] آج رسالتِ محمدی کو ثابت کرنے کے لئے، آپ کی اُمّیت کو ثابت کرنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی۔

أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ :

ہم ان (منکرینِ حق) کو اپنے نشانات و دلائل دکھا دیں گے۔ اُن کے چاروں طرف بھی اور خود اُن کی اپنی ہستیوں میں بھی تا آنکہ اُن پر پوری طرح واضح ہو جائے کہ یہ (کلام) برحق ہے۔ کیا یہ بات اُن کی تشفی کے لئے ناکافی ہے کہ تیرا رب (اس عالم آب وخاک کی) ہر چیز سے آگاہ ہے! (حٰمٓ سجدہ: ٥٣)

قرآن اور کائنات کی ہمنوائی

شروع میں عرض کیا گیا تھا کہ تمام اسلامی تعلیمات کا نچوڑ اور اُن کا لب لباب توحید، رسالت اور یوم جزا کا عقیدہ ہے۔ اُوپر کے مباحث سے یہ تینوں باتیں ثابت ہو گئیں، اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ یہ کائنات منظم و مربوط طور پر تخلیق کی گئی ہے۔ اس کے طبیعی (PHYSICAL)، کیمیائی (CHEMICAL) اور حیاتیاتی (BIOLOGICAL) اصول وضوابط میں کسی قسم کا انتشار اور بدنظمی نہیں ہے، جو یقیناً ایک عظیم ہستی کی کارفرمائی کا نتیجہ ہے۔ ان منظم ضوابط کی تعبیر قرآن میں "میزان" کے نام سے کی گئی ہے:

اللَّهُ الَّذِي أَنزَلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ وَالْمِيزَانَ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ :

اللہ ہی نے کتاب اور میزان کو ٹھیک ٹھیک مطابقت کے ساتھ اُتارا ہے اور تجھے کیا خبر کہ وقتِ موعود (قیامت) قریب ہی ہو۔ (شوریٰ: ١٧)

یہاں میزان سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز نپی تلی ہے، اور اس کے تمام قوانین منضبط ہیں خواہ وہ مادّی دنیا سے متعلق ہوں یا روحانی کائنات سے۔

فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ :

(کائنات میں) دوبارہ نظر ڈال کر دیکھ لو۔ کیا تمھیں کوئی بدنظمی نظر آرہی ہے؟ (ملک: ٣)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر ایک زبردست ہستی کے ماتحت اور کنٹرول میں جاری وساری ہیں، اور یہاں کوئی چیز بھی خواہ وہ کسی قسم کا مادہ (MATTER) ہو یا توانائی (ENERGY) اس کی حکم عدولی نہیں کرسکتی۔

وَلَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قٰنِتُوْنَ :

اور زمین و آسمانوں میں جو کوئی (اور جو کچھ) بھی ہے سب اسی کا ہے۔ ہر تمام اس کی بارگاہ میں جھکے ہوئے ہیں۔ (روم : ۲۶)

اسلام کا مطالبہ

ان ملاحظات کے بعد اسلام کا مطالبہ ساری نوع انسانی سے یہ ہے کہ جب ساری کائنات اور اس کے کل مظاہر خدائے قادر و توانا کے آگے جھکے ہوئے اور تکوینی (NATURAL) حیثیت سے اسی کی اطاعت و بندگی میں لگے ہوئے ہیں تو پھر انسان بھی ـــ جو تکوینی حیثیت سے پہلے ہی سے اس کا مسخر ہے ـــ تشریعی (MORAL) حیثیت سے بھی اسی برتر و عظیم ہستی کی الوہیت کو مان کر حیاتِ جاودانی کا مستحق بن جائے۔ اس سے کائنات میں یکسانی و یکرنگی پیدا ہو جائے گی اور دونوں کا نغمہ و ساز ایک ہو جائے گا :

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ :

کیا یہ منکرین دینِ الٰہی کے سوا کسی دوسرے دین کی تلاش میں ہیں ؟ حالاں کہ زمین و آسمانوں میں جو کوئی بھی ہے سب خوشی یا ناخوشی اسی کا مطیع و فرماں بردار ہے اور سب اسی کے پاس لوٹائے جا رہے ہیں۔ (آل عمران : ۸۳)

اس آیت میں یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ جب اس کائنات کی ہر چیز "مسلم" (مطیع و فرماں بردار) ہے تو پھر انسان کو بھی اسی کا مطیع و فرماں بردار ہونا چاہیے۔

نظامِ ربوبیت

یہاں پر یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ کائنات کا یہ نظم و ضبط اور اس کے ہمہ گیر اصول و ضوابط محض ربوبیت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل کی خاطر جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔ اگر ان میں بدنظمی و انتشار ہوتا تو ربوبیت بھی ثابت نہ ہو سکتی تھی۔ کیوں کہ ربوبیت کے معنی ہیں کسی چیز کو درجہ بدرجہ نشو و نما دے کر تکمیل تک پہنچانا۔ اس لئے ربوبیت میں انسان اور حیوانات و نباتات وغیرہ جملہ مخلوقات کی ضروریات کی فراہمی اور ان کی نگرانی اور

دیکھ بھال وغیرہ سب شامل ہے۔ اور ہم کو سلسلۂ علل و معلولات (CAUSE AND EFFECT) کے روپ میں حیوانات و نباتات سے قسم ہا قسم کے غلے، میوے، پھل، ترکاریاں، مسالے، گوشت، مچھلی وغیرہ مختلف قسم کی نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں۔ وہ اسی ربوبیت ہی کا ایک جزو اور نظامِ ربوبیت ہی کے ماتحت ہیں۔

اس لئے اسلام کا مطالبہ ہے کہ جو ہستی اس قدر رحمت و شفقت کا مظاہرہ اور اتنے عجیب و غریب اور حیرت انگیز طریقہ سے انسان کی تمام ضروریات کو پورا کر رہی ہے عقل، منطق، احسان شناسی اور انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ ایسی محسن و مشفق اور رحیم و رحمان ہستی سے منہ نہ موڑا جائے اور اُس کی اُلوہیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا جائے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَالسَّمَاءَ بِنَاءً وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ :

لوگو اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے والوں کو اس لئے پیدا کیا کہ تم اس سے ڈرو۔ (تمہارا رب) وہ ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور اُوپر سے پانی برسایا اور پھر اُس پانی سے تمہاری روزی کی خاطر (قسم ہا قسم) کے میوے اُگائے۔ سو تم جان بُوجھ کر کسی کو اللہ کا مقابل نہ ٹھہراؤ۔ (بقرہ : ۲۱ - ۲۲)

یہاں پر دو باتیں قابلِ غور ہیں : ایک تو خالقِ کائنات کا تعارف رب کے لفظ سے کرایا گیا ہے جو نوعِ انسانی کو اللہ تعالیٰ کی بندگی کی طرف بلانے کا فطری اور پیار بھرا طریقہ ہے۔ اور دوسرا آخری فقرہ اس حیثیت سے بڑا اہم اور معنی خیز ہے کہ آج پوری دنیائے سائنس غذائی مسئلہ کو سلجھانے اور مشینی طور پر موادِ لحمیہ (PROTIENS) اور موادِ نشاستہ (CARBOHYDRATES) وغیرہ کو جو غلّہ، پھل، میوے اور ترکاری وغیرہ کے اہم ترین اجزا ہوتے ہیں، مشینی پیمانے پر تیار کرنے میں ناکام ہو چکی ہے۔ مگر خدا کی رزق رسانی میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات کا ایک ہی

رب ہے، اور رہے گا۔ اسی پر دوسرے امورِ ربوبیت کو بھی قیاس کر لیجئے۔

يَآيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ :

لوگو! اللہ کی نعمت کو یاد کرو جس سے اُس نے تم کو نوازا ہے۔ کیا اللہ کے سوا ایسا کوئی دوسرا خالق بھی ہے، جو تم کو زمین و آسمان سے (ان دونوں کی قوتوں کو یکجا کر کے) کھلاتا پلاتا ہو؟ (حقیقت یہ ہے کہ) اس کے سوا کوئی دوسرا اِلٰہ (نرالے اور حیرت ناک افعال والا) موجود نہیں ہے۔ پس تم بہکے بہکے کدھر جا رہے ہو؟ (فاطر: ۳)

اسلام کا اصلاحی پروگرام

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی اور سیاسی انقلاب برپا کرنے سے پہلے ایک فکری و نظریاتی انقلاب پیدا کیا۔ وہ باہر سے لیپا پوتی اور بیرونی تبدیلیاں کرنے سے پہلے اندرونی طور پر دل و دماغ کو دھو کر اندر سے انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک خشک زمین میں بیج داب دینے سے اس میں کلّے نہیں پھوٹ سکتے اور برگ و بار نہیں آسکتے۔ جب تک کہ اس کو پہلے سے ہل چلا کر، گوڑ کر اور سینچ کر روئیدگی کے لئے پوری طرح تیار نہ کر لیا جائے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آغازِ اسلام کے وقت مکّی زندگی میں سب سے پہلے عقائد کی تنقیح کی گئی۔ اور جب اسلام قبول کرنے والوں میں عقیدہ و ایمان پختہ اور راسخ ہو گیا تو مدنی زندگی میں معاشرتی و تمدنی احکام نازل ہوئے، جس سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اگر شروع ہی میں تمام شرعی احکام نازل کر دئے جاتے تو ان کی قبولیت اور نفاذ میں بڑی دشواری پیش آتی۔ اس سے اسلام کی حکمتِ عملی اور بے نظیر دانشمندی کا پتہ چلتا ہے۔

یہ ہیں اسلام کے بنیادی عقائد و تصورات، اس کا مقصد اور نصب العین اور حکیمانہ و بے مثال طریقۂ کار۔ اسلام سراپا عدل اور سراپا دلیل و برہان ہے۔ اس سے بڑھ کر فطری، عقلی اور حقیقت پسند مذہب رُوئے زمین پر کوئی دوسرا موجود نہیں ہے۔

یَاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَاءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا :

لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے دلیل آچکی ہے اور ہم تمہارے پاس نورِ روشن (قرآن) بھیج چکے ہیں۔ (نساء : ۱۷۴)

ان وضاحتوں کے بعد اسلام کا بالکل صحیح، صریح اور غیر مبہم دعویٰ ہے کہ جو کوئی خدا پر ایمان لائے گا اور عملِ صالح (شریعتِ الٰہی) پر عمل پیرا ہو جائے گا وہی اخروی زندگی میں کامیاب و کامران رہے گا۔ اور جو کوئی ان ابدی و سرمدی سچائیوں کو جھٹلا کر ایمان و عملِ صالح سے انکار کردے گا، وہ ناکام و نامراد رہے گا۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ :

زمانہ (پوری تاریخ انسانی) شاہد ہے کہ تمام انسان گھاٹے میں ہیں سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک کام کئے اور ایک دوسرے کو حق بات اور ثابت قدمی کی تلقین کرتے رہے۔ (سورۂ عصر)

یہ چھوٹی سی صورت دینِ اسلام کا جوہری خلاصہ اور اصولی اعتبارات اس کی تمام تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ اس میں چار باتیں بیان کی گئی ہیں: (۱) ایمان (۲) عملِ صالح (۳) تلقینِ حق (۴) اور تلقینِ ثبات۔ یہ چار باتیں اس دینِ حق کے واضح اور مثبت پروگرام کا خاکہ اور بنیادی دستور (CONSTITUTION) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ چار خدائی ہتھیار ہیں جن سے دنیا کی کایا پلٹ ہو سکتی ہے۔ اور آج دنیا کو ان ہی چار چیزوں کی ضرورت ہے۔ قرآنی فلسفۂ تاریخ کی رو سے آغازِ آفرینش سے لے کر آج تک دنیا کی جس قوم نے بھی ان چار چیزوں کو اختیار کیا وہ دنیا کے اسٹیج پر برقرار رہی، اور جس نے ان کو ترک کر دیا وہ محفلِ ہستی سے اٹھا دی گئی۔ تاریخ انسانی کی اس شہادت کو "والعصر" کہہ کے پیش کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ چھوٹی سی مگر عظیم سورت دنیا کے پورے اصلاحی لٹریچر پر بھاری ہے۔ امام شافعیؒ نے بالکل بجا فرمایا کہ اگر انسان کی اصلاح کے لئے پورے قرآن کے بجائے صرف یہی ایک سورت نازل کر دی جاتی تب بھی کافی تھا۔

اسلام ایک ضرورت

غرض اسلام عیسائیت کی طرح محض ایک بے جان عقیدے کا نام نہیں، بلکہ ایک مکمل دستور العمل ہے، جو انسانی زندگی کے ہر موڑ پر واضح ہدایات دیتا ہے۔ اس کے عقائد انتہائی معقول، محکم اور متوازن ہیں، جن سے بہتر فطری اور جامع تعلیمات انسانی علم و مشاہدہ میں موجود نہیں ہیں۔ عصرِ حاضر کے ایک بہت بڑے ادیب جارج برنارڈ شا نے اسلام کی فطری اور سادہ تعلیمات سے متأثر ہو کر یہ پیشن گوئی کی تھی کہ اسلام ایک نہ ایک دن یقیناً ساری دُنیا کا مذہب بن جائے گا۔

آج دُنیا میں مختلف قسم کے مُہمل فلسفوں اور ازموں نے سر اُٹھا رکھا ہے۔ مگر رُوئے زمین پر پھیلی ہوئی خرابیوں اور بے چینیوں کو سوائے اسلام کے دنیا کا کوئی مذہب اور کوئی "ازم" دُور نہیں کر سکتا خواہ وہ کیمونزم ہو یا سوشلزم، کیپٹل ازم ہو یا نیشنل ازم۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ان تمام بے جان، غیر فطری اور مہلک ازموں کو ترک کر کے مساواتِ انسانی اور وحدتِ بنی آدم کا صور نہ پھونکا جائے، دُنیا میں امن و سلامتی کا دَور دَورہ ناممکن ہے۔ موجودہ گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں اسلام ہی روشنی کی کرن دکھائی دیتا ہے۔

يَاأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَّأُنثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقٰكُمْ :

لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں بانٹ دیا ہے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اب تم میں اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کا وفادار ہو۔ (حجرات : ١٣)

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ : اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری

۳ — قرآن اور سائنس

چند اُصول و کلیات

تمہید

اس مقالے میں قرآن مجید کی اصل حقیقت اور سائنس و قرآن کے باہمی روابط پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مقالہ اصل میں ڈاکٹر غلام جیلانی برق کی کتاب "دو قرآن" کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ موصوف نے سائنسی تحقیقات کو کچھ اس طمطراق کے ساتھ پیش کیا تھا کہ گویا یہی قرآن کا مطلوب و مقصود ہے اور قرآن کے بقیہ علوم غیر ضروری ہیں۔ حتیٰ کہ موصوف نے جوش اور ولولے میں دینِ متین کے بعض بنیادی اُصولوں تک کا انکار کر دیا ہے۔ اگر وہ توازن اور احتیاط سے کام لیتے تو اُن کی یہ کاوش یقیناً قابلِ قدر ہوتی اور اہلِ علم کو اُن کے دلائل پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کا موقع ملتا۔ افسوس کہ موصوف نے ذہن سازی کا نہ صرف ایک اچھا موقع کھو دیا بلکہ اہلِ علم کو بھی اپنا مخالف بنا ڈالا۔

سنا ہے کہ موصوف عرصہ ہوا اپنے انتہا پسندانہ نظریات خصوصاً انکارِ حدیث سے تائب ہو چکے ہیں۔ مگر موصوف کی تحریروں سے خدا معلوم کتنے لوگ دینِ حق سے برگشتہ اور علمائے کرام سے بدظن ہو چکے ہیں۔ خدا اُن کی لغزشوں کو معاف کرے۔

بہر حال یہی وہ کتاب ہے جس نے میرے ذہن و دماغ پر گہرے اثرات ڈالے اور مجھے ایک سنجیدہ علمی تحقیق پر آمادہ کیا جس کے نتیجے کے طور پر یہ سطور قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

قرآن اور عصرِ حاضر

قرآن حکیم ایک زندہ کتاب ہے اور قیامت تک ہر دور میں ایک زندہ اور اپٹوڈیٹ

کتاب رہے گا۔ اس کے عجائبات نہ کبھی ختم ہوئے ہیں اور نہ کبھی ختم ہوسکیں گے، خواہ دنیا کتنی ہی ترقی کر جائے۔ دنیا کی اس واحد عجیب وغریب کتابِ الٰہی میں ہر قسم کے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے معارف و دلائل پوری طرح رکھ دیئے گئے ہیں، جس کی بنا پر کسی کی یہ مجال نہیں رہتی کہ اس کے کتابِ خداوندی ہونے کا انکار کرسکے، سوائے کسی مقلدِ جامد کے۔ اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس میں تمام آنے والے زمانوں کی رعایت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ چنانچہ ایک زمانہ تھا کہ لوگوں میں اعلیٰ درجہ کی زبان دانی اور فصاحت و بلاغت کو سمجھنے کی استعداد تھی تو لوگ محض قرآن کی ادبیت کی برتری کے آگے گھٹنے ٹیک دیا کرتے تھے۔ مگر بعد کے زمانوں میں زبان دانی کا وہ معیار برقرار نہ رہا تو قرآنِ حکیم کی دوسری امتیازی خصوصیتیں منظرِ عام پر آنے لگیں اور اس کے عقلی و منطقی استدلالات اور اس کے دلنشین، قطعی و مسکت دلائل نے لوگوں کو مبہوت کرنا شروع کر دیا۔ پھر ایک زمانہ آیا کہ قرآن کی عقلی و فطری تعلیمات کے ڈنکے بجنے لگے اور ان تعلیمات کی ہمہ گیری نے نوعِ انسانی کو حیران و ششدر کر دیا۔

آج کل چونکہ سائنس کا دَور دَورہ ہے اور لوگوں کے ذہنوں پر سائنس اور سائنٹفک مسائل چھائے ہوئے ہیں، بلکہ ہر بات کو سائنس ہی کی عینک سے دیکھنے کا رجحان عام ہو گیا ہے تو قرآنِ عظیم اس میدان میں بھی پیچھے نہیں رہ جاتا اور اس جدید ذہن کو مطمئن کرنے کا پورا پورا سامان اور تریاق بھی اُس کے "خزانۂ عامرہ" میں موجود ہے۔ اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ وہ موجودہ بگڑے ہوئے دماغ کا آپریشن کس طرح کرتا ہے؟ اور بیمار و مریض ذہنوں کو چیر پھاڑ کر ان میں سرایت کردہ ملحدانہ و مادہ پرستانہ جراثیم نکال باہر کرکے، خداپرستی کے مفید و صحت مند عناصر کس طرح داخلِ دماغ کر دیتا ہے۔

قرآن کا موضوع اور اُس کے مقاصد

سب سے پہلے یہ بات ذہن میں اتار لینی چاہیے کہ قرآنِ حکیم سائنس یا کسی مخصوص فن کی کوئی کتاب نہیں ہے بلکہ اس کا بنیادی موضوع پوری نوعِ انسانی کی رہبری ہے۔ یعنی وہ انسان، کائنات اور خالقِ کائنات کے ربط و تعلق کو واضح کرکے انسان کی فکری رہنمائی کرتا اور اس کی روح کی غذا فراہم کرتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل مختصر طور پر یوں کی جاسکتی ہے کہ قرآنِ کریم پورے انسانی معاشرہ کی

فکری و اعتقادی، اخلاقی و معاشرتی اور سیاسی و اجتماعی ہر حیثیت سے کامل اصلاح چاہتا ہے۔ بلکہ وہ پورے انسانی معاشرہ کو ایک قبیلہ اور ایک خاندان کی شکل میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور یہ سارے مقاصد اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک کہ ذہن انسانی میں انسان، کائنات اور خالق کائنات کے تعلقِ باہمی کا صحیح تصور اور تخلیقِ کائنات کی غرض و غایت واضح نہ ہو جائے۔ لہٰذا وہ ان تعلقات کی نوعیت کو اجاگر کر کے توحید، رسالت اور معاد کا بنیادی تصور پیش کرتا ہے اور قرآنِ عظیم کی ساری تعلیمات کا اصل محور یہی تین بنیادی ستون ہیں جن پر دینِ الٰہی کی پوری عمارت تعمیر ہوتی ہے اور یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہئے کہ دنیا کی تمام گمراہ قوموں کو ـــــ خواہ اُن کا تعلق دورِ قدیم سے ہو یا دورِ جدید سے ـــــ اصلی ٹھوکر انھیں تین بنیادی امور کی حقیقت و اصلیت کے سمجھنے میں لگی ہے۔ اس لئے قرآن کریم اپنا سارا زور انہیں تین امور کے اثبات پر صرف کر دیتا ہے اور اس کے تمام عقلی و منطقی دلائل اور اس کے سارے آفاقی و انفسی آیات و نشانات انہیں تین بنیادی ستونوں کے گرد گھومتے ہیں اور قرآنِ عظیم کا ہر ہر صفحہ اس کا شاہد ہے۔

تفہیم کے طریقے

ان تین اہم اور بنیادی مقاصد کے اثبات اور ان کی حقیقت کو نوعِ انسانی کے ذہن و دماغ میں پوری طرح اتارنے کے لئے وہ مختلف اسالیب اور دلنشین طریقے استعمال کرتا اور نہایت قوی قطعی اور مُسکت دلائل فراہم کرتا ہے۔ جس کے بعد ان ازلی و ابدی صداقتوں کے انکار کی قطعاً گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، سوائے تقلیدِ جامد یا عذرِ لنگ کا سہارا لینے کے۔ نیز علاوہ علمی و عقلی دلائل کے وہ انسان کی مزید عبرت و بصیرت کے لئے کبھی تاریخ ماقبل سے استدلال کرتا ہے تو کبھی انبیائے سابقین، ان کی تعلیمات اور اُن کے نوشتوں سے، کبھی کائنات کی تخلیق اور اس کے نظامِ ربوبیت سے استدلال کرتا ہے تو کبھی خود انسانی فطرت اور اس کے حالات و کوائف سے، نیز کبھی وہ انسان پر خدائے برتر کی نوازشات اور اس کے احسانات کو یاد دلا کر انسانی جذبۂ احسان شناسی کو جھنجوڑتا ہے تو کبھی اپنے سخت ترین عذاب سے ڈراتا ہے تاکہ پوری نوعِ انسانی ان تین بنیادی امور کی اہمیت و معرفت سے آگاہ ہو جائے۔

نظامِ کائنات میں غور و فکر کی دعوت اور اس کے مقاصد

الغرض ترغیب و ترہیب کے ان تمام طریقوں کو اختیار کرتا اور آزماتا ہے جو ممکن ہو سکتے ہوں۔ انہیں طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ وہ انسان کو کائنات کی حقیقت و ماہیت اور اس کے عظیم و ہمہ گیر نظم و ضبط کا خود مطالعہ کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے جس کے دو بنیادی مقاصد ہیں۔

(۱) خود انسان جب مظاہرِ کائنات اور ان کے نظم میں اپنی عقل و تجربہ کی مدد سے غور و فکر کرے گا تو سب سے پہلے اور اولین طور پر یہ حقیقت کھل کر اس کے سامنے آئے گی کہ یہ کائنات اپنے ہمہ گیر نظم و ضبط کی بنا پر ایک خالق و صانع کی مقتضی ہے۔ پھر اس ہمہ گیری کے لازمی نتائج کے طور پر اس کی یکتائی، قدرت، ربوبیت اور اس کی عجیب و غریب حکمت کا حال بھی آشکارا ہو جائے گا۔

(۲) اور اس دعوتِ فکر کا دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ انسان کا اپنے خالق و مالک کے ساتھ ربط و اعتقاد محض علمی و نظری نہ رہے بلکہ وجدانی اور جذباتی بھی بن جائے۔ اور یہ ایمان و اعتقاد اس کی رگ رگ میں سرایت کر جائے۔ یہ مقصدِ ثانی مقصدِ اول کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور یہ مقاصد مشاہدۂ فطرت اور مطالعۂ کائنات سے حاصل ہوتے ہیں۔ جن کی بنا پر ایمانی حرارت اور اس کا ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے اور اسی ایمانی حرارت کے اثرات لازمی طور پر اس کی پوری زندگی کے نشیب و فراز پر اور اس کے کردار و کیرکٹر کی تعمیر و ترقی پر ایک برقی رو کے مانند اثر انداز ہوں گے اور نتیجۃً پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت کے سوتے اس کے انگ انگ سے پھوٹ نکلیں گے، جو کہ اصل مطلوب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نوعِ انسانی کو بار بار مطالعۂ کائنات کی نہ صرف دعوت دیتا ہے بلکہ مختلف انداز سے اس پر ابھارتا بھی ہے اور اس کا اصل طریقہ اس بارے یہ ہے کہ وہ بار بار نہ صرف علم و عقل کا حوالہ دیتا ہے بلکہ جامد تقلید پرستی کی سخت مذمت کرتا ہے۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّ

تَصْرِيْفِ الرِّيَاحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ط

زمین و آسمان کی تخلیق میں، دن رات کے ہیر پھیر میں، ان کشتیوں میں جو لوگوں کے فائدے کا سامان لے کر سمندر میں چلتی ہیں، اس پانی میں جس کو اللہ (سمندروں سے بخارات کی شکل میں لاکر ایک خاص) بلندی سے برسا دیتا ہے، پھر اسی پانی کے ذریعہ وہ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے۔ (چنانچہ وہ بیابان سے ایک لہلہاتے ہوئے سبزہ زار میں تبدیل ہو جاتی ہے) ان تمام جانداروں میں جن کو اس نے اس دھرتی (کے سینے) پر پھیلایا۔ ہواؤں کے (قانونِ) ادل بدل میں اور اس بادل میں (جو بغیر کسی سہارے کے ایک خاص بلندی پر) زمین و آسمان کے درمیان مسخر رہتا ہے ۔ ارباب عقل و دانش کے لئے (اس کی توحید و ربوبیت کے عظیم الشان) دلائل ہیں۔ (بقرہ : ۱۶۴)

قرآنِ حکیم میں اس قسم کی بے شمار آیتیں ہیں۔ لیکن یہ ایک بڑی ہی جامع آیتِ کریمہ ہے جس میں تقریباً سارے ہی اہم مظاہرِ کائنات کو انتہائی درجہ اختصار کے ساتھ سمیٹ دیا گیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ صرف اسی ایک آیت کی تشریح میں ایک ضخیم کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ دراصل ان مظاہرِ کائنات اور اس کے حیرت انگیز نظام و تحیر خیز ربط و ضبط میں اہلِ فکر و دانش کے لئے خالقِ کائنات کی وحدانیت و قدرت کے قطعی دلائل، اس کی حکمت و ربوبیت کے حیران کن مظاہر اور خصوصیت کے ساتھ نوعِ انسانی پر اس کی رحمت و رافت کے اتنے عجیب و غریب آیات و نشانات سامنے آتے ہیں کہ انسانی دل کی گہرائیوں سے اپنے خالق و مالک کی عظمت و جلال کے نغمے پھوٹ نکلتے ہیں اور اسی عظیم و پُرجلال ہستی کے سامنے انسان اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے خود کو اس کے آگے سجدہ ریز کر دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتا۔

وَفِي الْاَرْضِ اٰيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ط وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ط

اہلِ یقین کے لئے زمین میں (بھی قدرتِ خداوندی کی) نشانیاں موجود ہیں اور خود تمہاری اپنی ہستیوں میں بھی (تمہارے جسمانی و طبعی نظام میں) کیا تم نہیں دیکھتے؟ (ذاریات ۲۰-۲۱)

دستِ خداوندی نے صحیفۂ کائنات کے اوراق پر نہایت روشن اور جلی حرفوں میں اپنی قدرت و وحدانیت کے تمام بیّن دلائل و واضح نشانات مرتسم کردیئے ہیں جو ایک کھلی کتاب کی طرح صحیفۂ فطرت کا مطالعہ کرنے پر منکشف ہوتے ہیں۔

قرآن کی نظر میں چوپائے کون ہیں ؟

ان واضح آیات و دلائل کا انکار اب وہی لوگ کرسکتے ہیں جو صریح طور پر عقل و فطرت اور علم وعرفان کا گلا گھونٹنے والے ہوں۔ چنانچہ قرآن ایسے بدعقل اور کور باطن لوگوں کی مذمت کرتا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ :

آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ایسی ہیں جن پر سے یہ لوگ آنکھیں بند کرکے گزر جاتے ہیں۔ (یوسف : ۱۰۵)

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ :

کیا انھوں نے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت میں جو چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں اُن میں غور سے نہیں دیکھا؟ ہوسکتا ہے کہ ان کا وقت قریب آگیا ہو۔ اس (واضح پیغام) کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے ؟ (اعراف : ۱۸۵)

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ :

غور سے دیکھو آسمان اور زمین میں کیا ہے ؟ (حقیقت تو یہ ہے کہ یہ) آیتیں اور ڈراوے ایمان نہ لانے والی قوم کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ (حقیقت یہ ہے کہ ان کے قلوب تلاشِ حق کی صحیح تڑپ نہ ہونے کے باعث مردہ ہوچکے ہیں) بلکہ وہ بسا اوقات عقلِ صحیح سے کام نہ لینے والوں کو بہائم اور چوپایوں سے تشبیہ دیتا ہے۔ (یونس

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ :

اور ہم نے جہنم کے لئے بہت سے ایسے جنوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے جو دل ہونے کے باوجود نہیں سمجھتے اور آنکھیں ہونے کے باوجود نہیں دیکھتے اور کان ہونے کے باوجود نہیں سُنتے۔ یہ لوگ مویشی جیسے ہیں۔ بلکہ (ایک حیثیت سے) اُن سے بھی زیادہ بھٹکنے والے۔ (انعام: ۱۷۹)

ان آیات میں دراصل مقلدینِ جامدین کو — خواہ وہ کسی بھی گروہ اور کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں — خوب لتاڑا اور اُنھیں آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ایسے لوگوں کا مقام واقعی بہائم سے بھی بدتر نظر آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بہائم کے عقل و شعور سے عاری ہونے کے باوجود اُن میں اپنا ذاتی نفع و نقصان پہچاننے اور اپنے مالک کے اشاروں پر چلنے کی اہلیت و قابلیت بھی ایک حد تک رہتی ہے۔ اس کے برعکس یہ عقل و فطرت کے اندھے — باوجود اعلیٰ درجہ کی قوتوں (احساس، ادراک اور شعور) سے مالا مال ہونے کے — نہ تو اس نظامِ کائنات کے مشاہدہ سے صحیح نتائج حاصل کرتے ہیں اور نہ اپنا ذاتی نفع و نقصان ہی پہچانتے ہیں۔ لہٰذا ان کا مقام جانوروں سے بھی بدتر ہے اور أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ کا فقرہ بڑا ہی بلیغ اور جاندار ہے۔

منکرین پر حجت

اسی طرح وہ منکرینِ خدا اور منکرینِ آخرت پر حجت قائم کرنے کے لئے بھی نظامِ کائنات سے استدلال کر کے بار بار صحیح مشاہدہ، صحیح علم اور صحیح عقل کی اپیل کرتا ہے اور صحیح نتائج کی تحصیل پر متنبہ کرتا ہے بلکہ ترغیب و ترہیب کے مختلف طریقوں کو بھی آزماتا ہے۔

أَوَلَمْ يَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ أَفَلَا يُؤْمِنُونَ :

کیا منکرین نے نہیں دیکھا کہ ارض و سماوات دونوں پہلے ملے ہوئے تھے۔ پھر ہم نے

ان دونوں کو جدا کیا اور پانی سے ہر زندہ چیز پیدا کی ۔ تو کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے ؟
(انبیاء : ۳۰)

نیز فرمایا :

اَوَلَمْ یَتَفَکَّرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِہِمْ مَا خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَہُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّی وَاِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ بِلِقَآءِ رَبِّہِمْ لَکٰفِرُوْنَ :

کیا انھوں نے (خود) اپنی ہستیوں میں غور نہیں کیا ؟ (کہ ان کا وجود اولین طور پر کیونکر ہوا ؟ پھر ان کا حیرت انگیز جسمانی و طبعی نظام کیسے اور کیونکر چل رہا ہے ؟ اگر اس نہج پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ) اس نے آسمانوں اور زمین کو (بیکار نہیں) صرف حق کے ساتھ اور ایک مقررہ مدت تک پیدا کیا ہے (مگر) بہت سے لوگ اپنے رب کی ملاقات کے منکر ہیں ۔ (روم : ۸)

دلائلِ آفاق کا اظہار اور اس کے مقاصد

یہ ہے قرآن سے سائنس کے تعلقات کی نوعیت اور اس کی اصل حقیقت ۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ قرآن حکیم اس دعوتِ فکر ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ وہ انسان — خصوصیت کے ساتھ اہلِ ایمان — کے مزید اطمینانِ قلب کے لئے نظامِ کائنات کے تذکرہ اور اس کی لپیٹ میں چند ایسے حقائق کا بھی اظہار کر دیتا ہے جو آگے چل کر (یعنی خود اس کے اپنے غور و فکر اور تلاش و جستجو کے باعث، یا بالفاظِ دیگر علمِ سائنس کی ترقی کے باعث) اس کے سامنے آسکیں ۔ اور اس طریقۂ کار کے کئی مقاصد ہیں ۔

(۱) اس کلامِ برتر کی صداقت و حقانیت واضح ہو جائے ۔

(۲) اس کو ماننے والوں کے لئے اطمینانِ مزید یا پختگیٔ ایمان کا باعث ہو ۔

(۳) منکرین پر حجت قائم ہو جائے ۔

(۴) علمِ الٰہی کی قدامت اور احاطۂ جزئیات کا ساری دُنیا مشاہدہ کرلے ۔

غرض یہی مقصود اس آیتِ کریمہ سے ہے :

سَنُرِیْہِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِہِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمْ

اَنَّهُ الْحَقُّ :

ہم عنقریب ان منکرین کو اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں (بھی ، یعنی ان کے چاروں طرف) اور خود ان کی اپنی ہستیوں کے اندر بھی دکھادیں گے تاآنکہ انہیں اس (کلام برتر) کے حق ہونے کا یقین ہوجائے ۔ (حٰم سجدہ : ۵۳)

دلائلِ آفاق و انفس اور علومِ جدیدہ

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کے بمصداق، علومِ جدیدہ کی ترقی کی بدولت ان آفاقی اور انفسی دلائل کا ایک انبارِ عظیم وجود میں آچکا ہے ۔ اور قرآنِ حکیم کے ایک ایک دعوے کی حقیقت و صداقت آشکارا ہوتی چلی جارہی ہے ۔ لہٰذا اب دُنیا کو اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں رہا کہ وہ قرآنِ حکیم کی حقانیت کو تسلیم کرکے اس کے بتائے ہُوئے ضابطۂ حیات کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے ۔ ان آفاقی دلائل کی وضاحت کے لئے تاریخ، جغرافیہ اور آثارِ قدیمہ کے علاوہ علم فلکیات ، طبعیات اور کیمیا وغیرہ کا مطالعہ ازبس ضروری ہے ۔ اسی طرح دلائلِ انفس کی حقیقت اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتی جب تک کہ حیاتیات (BIOLOGY) کے مباحث خصوصاً متعلقاتِ انسانی کا مطالعہ نہ کیا جائے ۔

کیا قرآن سائنس کا پیغام ہے ؟

یہ ہے قرآن کا اصل مقصد اور اس کا طریقۂ کار ۔ لہٰذا جن لوگوں نے سائنسی آیات و مضامین (متعلقاتِ نظامِ کائنات) کو بنیاد بناکر اپنی ساری ذہنی صلاحیتیں قرآن کو سائنس کی کتاب قرار دینے پر صرف کردی ہیں، انہوں نے قرآن اور اس کی دعوت اور اس کی رُوح کو سمجھنے میں ـــ دانستہ یا نادانستہ ـــ سخت ٹھوکر کھائی ہے ۔ قرآن سائنس کا پیغام پیش نہیں کرتا ، بلکہ توحید، رسالت اور معاد کا پیغام پیش کرتا ہے اور وہ ان اصل پیغامات کے افہام وتفہیم کے لئے سائنس کو محض ایک ذریعہ اور معاون قرار دیتا ہے نہ کہ اصل مقصد ۔ اور قرآنِ عظیم میں سائنسی آیات (متعلقاتِ نظامِ کائنات) کی زیادتی بھی اسی بنا پر پائی جاتی ہے کہ مومنین کے برعکس منکرین کی تعداد ہمیشہ زیادہ پائی گئی اور پائی جاتی

ہے۔ قرآن حکیم کا پیغام چونکہ آفاقی، عالمگیر اور دائمی و ابدی پیغام ہے اس لئے اس میں اس قسم کی آیات کی زیادتی پائی جاتی ہے تاکہ وہ پوری نوعِ انسانی کو اپنی طرف متوجہ کر سکے اور منکرینِ خدا و آخرت پر حجت پوری کر سکے۔ لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (یٰسٓ) کا یہی مطلب ہے۔

مطالعۂ کائنات کا سب سے بڑا مقصد

* اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ۗ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ:

یقیناً آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور لیل و نہار کے ادل بدل میں پختہ عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ اور یہ پختہ عقل والے وہ لوگ ہیں جو کھڑے، بیٹھے، لیٹے (ہر حالت میں) اللہ کا ذکر کرتے اور آفرینشِ ارض و سما میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں (کہ) اے ہمارے رب تو نے یہ ساری چیزیں بیکار نہیں بنائی ہیں۔ پاک ہے تیری ذات (کہ تو ان کو بلا مقصد پیدا کردے) لہٰذا ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے اے ہمارے رب! جس کو تو آگ میں داخل کردے تو یقیناً تو نے اس کو رسوا کیا (اور نظامِ عدل سے) تجاوز کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ اے ہمارے رب! ہم نے ایمان کی منادی کرنے والے کا یہ پیغام سن لیا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ، پس ہم ایمان لے آئے۔ اے ہمارے رب! ہمارے گناہوں کو معاف فرما اور ہماری برائیوں کو ہم سے دور فرما اور ہمارا خاتمہ نیکوں کے ساتھ فرما۔ (آل عمران: ۱۹۰ - ۱۹۳)

ان آیات میں سائنس کے چہرے کی پوری طرح نقاب کشائی کی گئی ہے، جس سے یہ حقیقت پوری طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ اس نظامِ کائنات میں غور و فکر کا اصل مقصد کیا ہے؟ لہٰذا اربابِ عقل و نظر جب خالق کائنات کی ... پر غور و فکر کریں گے تو لامحالہ انہیں ... کی عظمت و رفعت کا مشاہدہ ہوگا

اور خالقِ کائنات کے جلال و جبروت کی بنا پر اُن کے سینوں میں خوف و خشیت کے جذبات کا ایک دریا موجزن ہو جائے گا۔ اور وہ اپنی حاصلِ تحقیق کے طور پر اس کی تخلیق بامقصد کا اعتراف کر لینے پر مجبور ہوں گے فیصلے کے دن کو حق سمجھ کر اس کے عذاب سے پناہ مانگیں گے اور اپنے مومن ہونے کا اعلان کر کے اپنے عجز و انکساری کا صاف صاف اعتراف کر لیں گے جس کی صورت یہ ہو گی کہ وہ اپنے گناہوں کی معافی چاہیں گے اور توبہ و استغفار اور رجوع و انابت کی راہ اختیار کریں گے۔

یہ ہے وجدانی اور جذباتی ایمان جو مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی، اور علمی و عقلی ایمان سے کہیں زیادہ پائدار ہوتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس صفت سے متصف نفوسِ ربانی کے انگ انگ سے توحید و تقویٰ کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اسی لئے فرمایا :

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ :

اللہ سے اس کے بندوں میں سے صرف عالم ہی ڈرا کرتے ہیں۔ (فاطر : ۲۸)

اور یہ بات خصوصی طور پر مظاہرِ کائنات میں غور و فکر کرنے والوں کے حق میں بولی گئی ہے۔

مطالعۂ کائنات اور ذکرِ الٰہی

یہ بات بالکل منطقی اور مبنی بر حقیقت ہے کہ جب نظامِ کائنات میں تفکر و تدبر سے کام لیا جائے گا تو نتیجے کے طور پر خالقِ کائنات کی عظمت و جلال کے نغمے دل کی گہرائیوں سے پھوٹ نکلیں گے جو صحیح معنی میں " ذکرِ الٰہی " کا روپ دھار لیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں " ذکر " کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ بلکہ یہ بات اسلام کے فطری اور حقیقت پسند مذہب ہونے کی بھی ایک بیّن دلیل ہے۔ اور سب سے بڑھ کر خود آیتِ کریمہ (الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) صاف صاف اعلان کر رہی ہے کہ تفکرِ کائنات اور ذکرِ الٰہی دونوں لازم و ملزوم ہیں، یعنی یہ ذکرِ الٰہی غور و فکر کا لازمی نتیجہ ہے، ہو گا در ہونا ہی چاہیئے۔

اس نکتے کی بات ... مطالعۂ ... غور و فکر ... ذکرِ الٰہی کی

منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے برعکس ایک عامی ــــ جو غور و فکر کے صفات سے عاری ــــ ہے جو پہلے ہی ذکرِ الٰہی میں مشغول ہے۔ اب ان دونوں میں اس حیثیت سے کوئی فرق نہیں ہو سکتا کہ دونوں ایک ہی غذا کے متناول اور ایک ہی حقیقت سے دوچار ہیں۔ ہاں فرق جو کچھ بھی ہوگا وہ صرف ان دونوں کی کیفیت اور مراتب میں ہوگا، نہ کہ کمیت اور مقدار میں۔ جس طرح کہ مقدارِ حرارت اور درجۂ حرارت میں فرق و تفاوت ہو سکتا ہے۔

لہٰذا آج سائنس کا نام لے کر ذکرِ الٰہی کی مذمت کرنا یا مُلّا پر سب و شتم کرنا نہ صرف کم فہمی کی علامت ہے بلکہ حقیقت کا بھی منہ چڑانا ہے۔ اس قسم کے لوگ مذہب کی حقیقت سے تو بھلا کیا واقف ہوتے خود انسانی فطرت، نظامِ کائنات اور اس کے قوانین تک سے نابلد ہیں بلکہ لا الٰی ھٰؤلاء ولا الٰی ھٰؤلاء کا ایک جیتا جاگتا نمونہ ــــ قرآن مجید ایک موقع پر تو صاف صاف کہتا ہے:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (رعد: ۲۸)

جان لو کہ اللہ کے ذکر سے دل مطمئن ہوتے ہیں۔ مطالعۂ کائنات کی اصل غرض و غایت ہی ذکرِ الٰہی ہے۔ مطالعۂ کائنات سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں جو اس علم کے اصلی تحفے ہیں، ذکرِ الٰہی اور فکرِ آخرت۔ ایک عارف نے بہت خوب فرمایا: الذکر للانسان کالماء للسمك فكيف يكون السمك اذا فارق الماء۔ اور سب سے بڑا ذکر نماز ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔

سائنس مذہب تک پہنچنے کا ذریعہ

الغرض یہ خدا شناسی اور خدا رسائی اس سارے غور و فکر کا ماحصل اور نتیجہ ہے اور ہوگا، اور ہونا بھی چاہئے۔ اگر کسی سائنس داں نے اپنی پوری عمر غور و فکر میں گزار دی اور تحقیقات و نظریات کا ایک ڈھیر بھی تیار کر دیا مگر پھر بھی ان نتائج تک نہ پہنچ سکا تو گویا اس نے اپنی عمرِ عزیز بیکار ہی صرف کر ڈالی۔ اس کے برعکس اگر کوئی ایمان و عملِ صالح پر مضبوطی سے کاربند رہا تو اس نے حقیقی کامیابی حاصل کر لی، اگرچہ وہ سائنس سے نابلد ہی رہا ہو، کیونکہ سائنس اصل مقصد نہیں، بلکہ مقصودِ اصلی

(مذہب) تک پہنچنے کا محض ایک ضمنی ذریعہ ہے۔ اور اس لئے بھی کہ علوم سائنس سے بہرہ ور ہونا اور نظام کائنات میں غور و فکر کرنا ہر ایک کا کام بھی نہیں ہو سکتا، اور نہ سطحی غور و فکر سے کوئی خاص نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے۔ بلکہ یہ تو اہلِ علم اور جہابذۂ فن کا معرکہ ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ فَسِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ؎

اور ہم نے ہر ایک اُمت میں ایک رسول بھیجا (اور تمام رسولوں کی مشترکہ تعلیم اور دعوت یہی تھی کہ) لوگو! اللہ پرست بن جاؤ اور طاغوت (پرستی) سے باز آ جاؤ۔ تو ان میں بہتوں کو اللہ نے راہِ راست سے نوازا اور بہتوں پر گمراہی ثابت ہوئی۔ چنانچہ زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ (راہِ راست کو) جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا؟ (نحل : ۳۶)

مطالعۂ تاریخ کا اصل مقصد

آیتِ بالا میں منکرین کو قائل کرنے اور خدا پرستی کی طرف ان کی توجہ مبذول کرنے کے لئے تاریخ، جغرافیہ اور آثارِ قدیمہ کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ پس اگر کوئی مذکورہ بالا علوم کا بڑا ماہر ہو مگر پھر بھی اس کو ان اوراقِ پارینہ میں حقیقتِ حال کا جلوہ اور اس ابدی صداقت و سچائی کا مشاہدہ نہ ہو سکا، یعنی قوموں کے حالاتِ نفسی اور فلسفۂ تاریخ سے اس نے صحیح نتائج نہیں نکالے اور فرمانبرداروں اور نافرمانوں کے حالات کا تقابلی مطالعہ کر کے مومنین کی حیرت انگیز کامیابی اور منکرین کی حیران کن اور عبرت خیز شکست و رسوائی کے اسباب کی راز جوئی نہ کر سکا، اس سے صحیح فیصلے اخذ نہیں کئے اور نتیجے کے طور پر مذکورہ بالا عالمگیر و ابدی خدا پرستی کا اعتراف نہ کر سکا تو پھر اس سے بڑا بدنصیب اور کون ہو سکتا ہے؟ یہی حال دیگر تمام علوم کا بھی ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے خوب فرمایا ؎

توحید کا مسئلہ ہے اصلی
باقی ہیں شگوفے ہسٹری کے

تمام انبیائے کرام کی مشترکہ تعلیم

نیز اس آیتِ کریمہ سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ تمام انبیائے کرام کی پوری تعلیمات کا نچوڑ اور لبِ لباب صرف دو باتوں پر مشتمل تھا :

(۱) خدا پرستی کا اثبات

(۲) طاغوت پرستی سے اجتناب

تفاسیر میں لفظ طاغوت کی جتنی بھی تشریحیں کی گئی ہیں، ان سب کے پیشِ نظر موجودہ زبان میں اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس میں ہر قسم کے "خود ساختہ اِزموں" کا رد کیا گیا ہے۔ چنانچہ کمیونزم، سوشلزم، نیشنلزم، فاشزم، ٹیڈی ازم، ہپی ازم وغیرہ وغیرہ ہر قسم کے شیطانی اِزموں کا ابطال کر کے نجات کی راہ صرف ایک واحد ازم میں محدود کر دی گئی ہے اور وہ ہے " اسلام اِزم" اور یہی واحد ازم تمام انبیائے کرام کی تعلیم کا ماحصل تھا۔ اسی لئے فرمایا :

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ‎:

اور جو طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا تو گویا کہ ایک مضبوط سہارا اس کے ہاتھ آ گیا جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ (یعنی آخرت کی حیاتِ جاودانی کے علاوہ خود دنیا میں بھی اطمینانِ قلب اور امن و امان نصیب ہوگا) اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے (یعنی ہر ایک کے خلوصِ نیت سے بخوبی واقف) (بقرہ:۲۵۶)

طاغوت پرستی اور تجدد

ضمناً یہاں پر ایک بات یہ بھی سمجھ لینی چاہئے کہ اس آیتِ کریمہ میں خدا پرستی کی اولین شرط یہ قرار دی گئی ہے کہ پہلے ہر قسم کے خود ساختہ نظریات کا انکار اور تمام گمراہ کن " پرستیوں" سے توبہ کر کے خدا کے حضور آیا جائے، جب کہیں ان کی خدا پرستی معتبر ہوگی۔ جیسا کہ کفر بالطاغوت کی ایمان باللہ پر تقدیم سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس میں رد آ گیا ان تمام متجددین کا جو اپنے باطل مقاصد اور غلط نظریات کو پروان چڑھانے کے لئے خود اسلام ہی کا سایہ اور اس کی آڑ لینا چاہتے ہیں۔ مثلاً اسلامی سوشلزم و

اسلامی نیشنلزم وغیرہ کے نعرے یہ خدا پرستی نہیں بلکہ طاغوت پرستی کو پروان چڑھانے کے لئے خدا پرستی کو محض ایک کھلونا بنا لینا ہوا۔ اگر کسی کو خدا پرستی کا اقرار ہو تو پھر اس کو یہ دوئی اور دورنگی ختم کرنی پڑے گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی بیک وقت خدا کو بھی راضی و خوش رکھے اور طاغوت کو بھی۔ لہٰذا ایک وقت میں صرف ایک ہی نعرہ بلند ہو سکتا ہے۔ صرف اسلام، یا صرف سوشلزم، یا صرف نیشنلزم۔ وَقِسْ عَلٰی ذٰلِکَ۔

دینی احکام و مسائل کی اہمیت

نیز یہ اور اسی قسم کی دوسری بہت سی آیات ـــــ یہاں پر مثالیں پیش کرنا تطویل کا باعث ہوگا ـــــ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تمام انبیائے کرام کی اصل تعلیم محض خدا پرستی ہے۔ یعنی لوگوں کو ان باتوں کی تعلیم دینا جن کو لوگ محض عقل و تجربہ کی مدد سے حاصل نہیں کر سکتے۔ بالفاظِ دیگر انبیائے کرام کی تعلیم کا اصل محور مابعد الطبیعات (META PHYSICS) ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف وہ طبیعاتؔ مادیات یا قوانینِ فطرت و نظامِ کائنات وغیرہ سے تعرض نہیں کرتے۔ یا اگر تعرض کرتے بھی ہیں تو صرف استدلال ہی کی حد تک، اور وہ بھی اجمالی حیثیت سے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ اس قسم کے دنیوی علوم کو انسان خود ہی اپنے مشاہدہ و تجربہ کی مدد سے حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس وہ ماورائے مادیات یا ماورائے کائنات کے حقائق و کوائف کا ادراک محض اپنی عقل و تجربہ یا مشاہدۂ کائنات سے حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی طرح وہ محض عقل و فکر سے انسان اور خالقِ کائنات کے صحیح تعلقات اور بہت سے دینی و دنیوی احکام و امور کی اصل حقیقت اور اُن کی کُنہ تک بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ان امور کی نقاب کشائی اور ان کی اصلیت کو نوعِ انسانی کے سامنے اُجاگر کرنے ـــــ اور ان کی تعلیم و تدریس کے لئے انبیائے کرام تشریف لاتے ہیں۔

اسی لئے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ یعنی تم اپنے دُنیوی معاملات کو بخوبی جانتے ہو۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید سائنس کے مسائل نہیں بیان کرتا۔ اس کا مقام اس سے کہیں زیادہ برتر و اعلیٰ ہے۔ چنانچہ وہ اجمالی طور پر صرف نظامِ کائنات کا ذکر کرتا ہے۔ کائنات کے بڑے بڑے مظاہر کا بیان کرتا ہے۔ انہیں کو وہ موقع بموقع دہراتا ہے۔ اور ان مظاہر میں جاری و ساری بعض

قوانین اور ان کی بعض خصوصیات کی طرف اجمالی حیثیت سے اشارے کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس وہ دینی احکام و مسائل کی بنسبت نظامِ کائنات کے خوب تفصیل کرتا ہے بلکہ اکثر جزئیات تک بیان کرتا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ وہ ان امورِ دنیوی کو انسان کے حوالے کر کے اس کے عقل و تجربہ اور فہم و بصیرت پر کلی اعتماد کر لیتا ہے۔ لہٰذا دینی امور و احکام اصل ہوئے اور دنیوی امور محض توابع و ذرائع۔

اشاروں ہی اشاروں میں مظاہرِ کائنات سے متعلق قرآن مجید میں جہاں کہیں بعض جزئی مسائل ملتے ہیں وہاں پر ان جزئیات کے تذکرہ کے دو اہم مقاصد ہیں۔

(۱) علمِ الٰہی کی قدامت کا اظہار

(۲) خالقِ کائنات کی رحمانیت کا مشاہدہ

یہ جزئی امور یا حقائقِ کائنات ایک علمی انکشاف کے طور پر مذکور ہوتے ہیں۔ جو علمِ انسانی (حقائقِ کائنات سے متعلق) کی ترقی کے بعد جلوہ گر ہوتے ہیں۔

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

اللہ نے زمین و آسمانوں کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقیناً اس باب میں اہلِ ایمان کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)

سائنس یا علمِ انسانی کی ترقی کے بعد جب یہ حقائقِ قرآنی انکشافات کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں تو یہ اہلِ اسلام کی تقویتِ ایمانی کا باعث ہوتا ہے، یعنی عصری علوم و افکار اُن کے پائے ثبات کو ڈگمگا نہیں سکتے اور ان کے پائے ثبات میں کسی قسم کی لغزش نہیں آسکتی۔

اصلی اُولوا الالباب

حاصلِ بحث یہ نکلا کہ خدا پر ایمان لانا اور اس کے احکامات پر عمل کرنا اصل مقصد ہے۔ جو اس پر مضبوطی سے قائم رہا اُس نے فلاح پائی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے جہاں کہیں بھی مفلحون، فائزون اور وارثون وغیرہ کے تحت حاملینِ سائنس یا اُولو الالباب یا اُولو الابصار وغیرہ کو کوئی جگہ نہیں دی، بلکہ ہر جگہ انہیں پاکیزہ اور معزز ہستیوں کا ذکر فرمایا جو صحیح عقائد رکھنے والے صوم و صلوٰۃ کے

اصلی اولوالالباب

پابند اور اخلاق و سیرت کے اعلیٰ صفات سے متصف ہوں۔ اس کے علاوہ جابجا "ان الذین اٰمنوا و عملوا الصالحات" کے ماتحت بھی اسی اعلیٰ کردار و کیرکٹر سے متصف نفوسِ قدسیہ کو مختلف اسالیب میں جنّت اور آخرت کی کامیابی کی بشارت دی گئی اور جگہ جگہ انہیں مومنین، متقین اور رحمٰن کے بندے قرار دیا گیا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اصلی "اولوالالباب" یہی لوگ ہوسکتے ہیں اور ہوں گے۔ بلکہ درحقیقت اس موقع پر اولوالالباب کی ترتیب معکوس ہوجاتی ہے، اور قرآن مجید کا ہر صفحہ اس دعوے کی شہادت پیش کر رہا ہے۔ اس کے برعکس وہ نقلی قسم کے اولوالالباب جو ایمان و عملِ صالح سے عاری، علم و تحقیق کے پردے میں اپنی چرب زبانیوں اور خطابت کی زور بیانیوں سے قرآن مجید کی انقلابی دعوت کا دھارا روک دینا یا موڑ دینا چاہتے ہیں تو ایسے ہی لوگوں کو قرآن مجید یہ سند اور سرٹیفکٹ عطا کرتا ہے:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِىْ قَلْبِهٖ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ :

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کی (چکنی چپڑی) باتیں دنیوی زندگی میں اچھی لگتی ہیں اور یہ لوگ اپنے دلی خلوص سے (بار بار) خدا کی گواہی بھی پیش کریں گے، حالانکہ حقیقتاً یہی لوگ سخت قسم کے جھگڑالو ہوتے ہیں۔ (بقرہ : ۲۰۴)

التذکیر بآلاء اللہ

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سائنس کوئی مقصود یا اصل غایت نہیں بلکہ مقصودِ اصلی تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی ہمیشہ ذہن میں تازہ رہنی چاہئے کہ نظامِ کائنات اور اس کے متعلقات کے بارے میں جتنی بھی آیتیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں وہ تمام کی تمام نوعِ انسانی پر اللہ تعالیٰ کے احسانات و نوازشات کے ضمن میں بیان کی گئی ہیں اور پورے قرآن میں ہر جگہ یہی روح کارفرما نظر آتی ہے اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا اس سے مقصود انسان کے فطری جذبۂ احسان شناسی کو جھنجوڑنا اور اس کو اطاعتِ الٰہی پر اُبھارنا ہے۔ چنانچہ سورۂ نمل میں آیت ۶۰ سے لے کر آیت ۶۴ تک کائنات کے مختلف مظاہر کا جتنا جامع تذکرہ کیا گیا ہے کسی اور سورہ میں اتنی ساری باتوں کو یکجا طور پر بیان نہیں کیا۔ اس کے بعد

آیت ۱۸ میں صاف تصریح فرمائی :

وَإِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا :

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو شمار نہیں کر سکو گے ۔

ایک اور جگہ فرمایا :

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً :

اے مخاطب ! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں (اور ساری قوتوں) کو تمہارے کام میں لگا دیا، اور انہیں ظاہر و پوشیدہ تمام نعمتیں تم پر پوری کر دیں (کہ جس کے بعد تم کو اس کارزارِ حیات میں مزید کسی چیز کے عدم وجود کا احساس نہیں ہوتا جو وجودِ خداوندی کی بڑی دلیل ہے) (لقمان : ۲۰)

الغرض وہ جہاں کہیں بھی مظاہرِ کائنات کا تذکرہ کرتا ہے تو اپنے انعامات و احسانات کی طرف بھی کسی نہ کسی پہلو سے اشارہ کر دیتا ہے ۔ نیز اس کے علاوہ وہ متعدد مقامات پر انسان کی بداعمالیوں اور دھاندلیوں کے باوجود نوعِ انسانی پر اپنی عمومی رحمت و رافت کا تذکرہ بھی کرتا ہے :

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ط لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ :

اور تیرا رب بخشنے والا اور رحمت والا ہے ۔ اگر وہ لوگوں کو اُن کی حرکتوں کے باعث پکڑنے لگے تو ان کو عذاب دینے میں جلدی کر دے ۔ (کہف : ۵۸)

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ :

اور تیرا رب لوگوں کی زیادتی کے باوجود مغفرت والا ہے ۔ (رعد : ۶)

وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ :

اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے ۔ (اعراف : ۱۵۶)

اِس قسم کی آیات سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ پورا کارخانۂ حیات اس کی ہمہ گیر و وسیع رحمانیت ہی کی بنیاد پر چل رہا ہے۔ اگر اس کی اس آفاقی رحمانیت کا پرتو صرف چند لمحوں کے لئے بھی اپنی مخلوقات سے ہٹ جائے تو پھر یہ پورا کارخانۂ حیات آناً فاناً ختم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے "الفوزالکبیر" میں قرآن مجید کے علوم پنجگانہ میں مظاہر کائنات کے بیان کو ایک مستقل علم قرار دے کر اس کا ایک نہایت جامع عنوان "التذکیر بآلاء اللہ" قائم کیا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس مضمون کے لئے اس سے بہتر عنوان اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس عنوان میں اس مضمون اور اس کی تمام آیات کی اصل روح سمیٹ دی گئی ہے۔ یہ عنوان بالکل الہامی معلوم ہوتا ہے۔ نیز حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اصولی اعتبار سے نظامِ کائنات سے متعلق آیات کو قرآن کا ایک مستقل علم قرار دے کر بہت زیادہ دُور اندیشی اور دُور بینی کا ثبوت دیا ہے جو دراصل طلبۂ قرآن پر تفکر و تدبر کی راہیں کھولنے کے لئے ایک مہمیز کی حیثیت رکھتا ہے۔

الغرض قرآنِ کریم اپنے انعامات و احسانات کے ضمن میں کائنات کے بڑے بڑے مظاہر ہی کا تذکرہ کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ اپنے عمومی نشانہائے رحمت کا ذکر کرتا ہے جو تمام بنی نوعِ انسانی کے لئے بلا قید و بلا تخصیص عام ہوں۔ مثلاً زمین و آسمان، چاند، سورج، ستارے، دن، رات، پہاڑ، ہوا، ابر، بارش اور نباتات وغیرہ۔ ان عمومی مظاہر و نشانات کے بیان کے سلسلے میں قرآنِ حکیم دوہرے فوائد و مقاصد کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ چنانچہ یہ مظاہر و نشانات بیک وقت اللہ تعالیٰ کی عمومی رحمت کی نشانیاں بھی ہوتے ہیں، اور اس کی قدرت کے دلائل بھی۔ اور یہ انسان کے جذبۂ احسان شناسی کے لئے ایک مہمیز اور تازیانہ کا کام بھی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان مظاہرِ کائنات کا تذکرہ کر کے جگہ جگہ فرمایا کہ ان میں غور کرنے والوں کے لئے دلائل و اسباق موجود ہیں۔ چنانچہ ان مظاہرِ کائنات میں وجودِ خداوندی کے متعلق قطعی اور فیصلہ کن دلائل موجود ہونے کے علاوہ عمومی فوائد اور ان کے رحمتِ خداوندی ہونے کے خصوصی اسباب و وجوہات پر نظر کی جائے تو ایک خاصی ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ مثلاً چاند اور سورج کا زمین سے ایک خاص فاصلے پر ہونا، جس سے گرمی و سردی میں بہت زیادہ تفاوت نہیں ہوتا اور ہر دو سے ایک مقررہ روشنی بھی

حاصل ہوتی رہے۔ یا گرمی و سردی کا اچانک نہ آنا بلکہ بتدریج آنا، ورنہ پھر گرمی و سردی بالکل اچانک آنے کے باعث ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ یا آب و ہوا کو معتدل رکھنے کے لئے خشکی کو چاروں طرف سے سمندروں سے گھیرے رکھنا، ہوا کا ایک خاص نظام مقرر کرنا، بادل کے لئے ایک مخصوص بلندی کا مقرر کرنا، جس میں تفاوت کے باعث انسان کو کئی زحمتوں میں مبتلا ہونا پڑتا۔ یا زمین میں پانی کی پائپ لائنیں بچھانا، اس نظم کے ساتھ کہ وہ پانی زمین میں دھنس کر بہت اندر نہ چلا جائے بلکہ ایک مخصوص سطح پر دوڑتا رہے۔ (ملک : ۳۰) اور ایک بہت ہی عجیب وغریب رحمت یہ کہ سمندر کے کڑوے اور نمکین پانی کو بخارات کے ذریعہ اُٹھا کر اس ترکیب سے بارش برسانا کہ سمندری پانی کی یہ نمکینی بالکل زائل ہو جائے ورنہ انسانی زندگی بڑی دوبھر ہو جاتی۔ سورۂ واقعہ کی اس آیت میں :

لَوْ نَشَآءُ جَعَلْنٰهُ اُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُوْنَ :

اگر ہم چاہتے تو اس پانی کو کڑوا بنا دیتے۔ پس تم کیوں نہیں شکر کرتے۔

اسی حقیقت و صداقت کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

غرض رحمتِ خداوندی کے یہ عمومی نشانات اتنے واضح اور عام ہیں کہ ان سے ایک عامی اور عالم دونوں اپنے اپنے ظرف کے مطابق بخوبی عبرت پذیر ہو سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان مضامین کی تکرار یا ان عمومی نشانات کو مختلف اسالیب میں ذکر کرنے کا راز یہ ہے کہ وہ ایک عامی یا عالم، ہر ایک کے ذہن میں ان نشانہائے رحمت کی اہمیت اتار دیتا ہے اور احساناتِ الٰہی کی یاد دہانی کراتے رہنا چاہتا ہے۔ یہی مطلب ہے التذکیر بآلاء اللہ کا۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنْ يُّرْسِلَ الرِّيٰحَ مُبَشِّرٰتٍ وَّلِيُذِيْقَكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَلِتَجْرِيَ الْفُلْكُ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ :

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ بات کہ وہ ہواؤں کو بھیجتا ہے خوشخبری دینے والیاں بنا کر اور تم کو اپنی رحمت سے نوازنے کی خاطر اور تاکہ کشتیاں (بھی انہیں ہواؤں کی بدولت سمندر میں)

اس کے حکم سے چل سکیں، تاکہ تم (ان کشتیوں کے ذریعہ تجارت کرکے) اس کا فضل تلاش کرسکو اور اس کا شکریہ ادا کرسکو۔ (روم: ۴۶)

وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ :

اور اس نے اپنی رحمت ہی کی وجہ سے تمہارے لیئے رات اور دن بنایا، تاکہ تم رات میں سکون محسوس کرسکو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرکے اس کا شکریہ ادا کرسکو۔ (قصص: ۷۳)

پہلی آیت میں ہوا اور دوسری آیت میں دن اور رات کو اپنی رحمت کے نشانات کے طور پر ذکر کرکے ان کے مختلف فوائد کی طرف اشارہ فرمایا اور جیساکہ گزر چکا اسی قسم کی چیزوں کو اکثر و بیشتر اپنی قدرت و وحدانیت کے دلائل کے طور پر بھی بیان کرتا ہے اور اس لحاظ سے سورہ روم کی مذکورہ بالا آیت ان دونوں باتوں کی جامع ہے۔ غرض وہ بار بار نوع انسانی سے شکرگزاری اور نمک حلالی کے جذبات کی اپیل کرتا ہے۔ اور شکرگزاری کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے خالق و مالک اور رب کریم کا مطیع و فرمانبردار بن جائے جیساکہ حسب ذیل آیتوں سے واضح ہوتا ہے:

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرَاتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَا اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝

کیا انھوں نے ان پرندوں کو نہیں دیکھا جو فضائے آسمانی میں رکے رہتے ہیں، جنہیں

بجز خدا کے اور کوئی تھام نہیں سکتا ؟ بلاشبہ اس میں ایمان لانے والوں کے لئے نشانیاں ہیں' اور اللہ نے ہی تمہارے لئے گھروں کو سکون کا ذریعہ بنایا (کہ تم سردی' گرمی' بارش اور دیگر آفات سے بچے رہتے ہو) اور (اسی طرح) تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں کے بھی گھر (خیمے) بنائے، جنہیں تم اپنے سفر اور اقامت کی حالت میں ہلکے اور خفیف محسوس کرتے ہو اور ان جانوروں کے اُون' روئیں اور بالوں سے (بہت سی) گھریلو اور مفید چیزیں ایک مدت تک چلنے والی بھی بنائیں اور اللہ ہی نے تمہارے لئے اپنی پیدا کردہ چیزوں کے سائے بنائے۔ (دھوپ سے بچنے کا ذریعہ بنایا' جس سے تم گرمیوں میں راحت محسوس کرتے ہو) اور اسی نے تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ گاہیں (غار وغیرہ) بنائیں اور تمہارے لئے ایسے کرتے بنائے جو تمہیں دھوپ سے بچاتے ہیں اور ایسے (آہنی) پیرہن بھی جو بحالتِ جنگ تمہاری حفاظت کرتے ہیں[1] اسی طرح وہ اپنی نعمتیں تم پر پوری کرتا ہے تاکہ تم اس کے فرمانبردار بنو۔ اگر وہ روگردانی کریں تو تمہارے ذمہ تو بس صاف بات پہنچا دینا ہے۔ یہ لوگ (دراصل) اللہ کی نعمتوں کو پہچانتے ہیں۔ پھر (تجاہلِ عارفانہ کے طور پر) اُن سے انجان بن جاتے ہیں اور ان میں کے اکثر لوگ تو کافر ہی ہیں۔ (نحل : ۷۹ - ۸۳)

کیا اسلام نے مسلمانوں پر دنیوی نعمتیں حرام کر دی ہیں ؟

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ مظاہرِ کائنات کے سلسلے کی ساری چیزیں انعامات و احساناتِ الٰہی کے ضمن میں وارد ہوئی ہیں تو اب یہاں پر ایک ضمنی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نعمتوں کے اصل مستحق کون ہیں ؟ اور خدا کی ان نعمتوں سے کن لوگوں کو فائدہ اٹھانا چاہیئے ؟ کیا صرف اہلِ یورپ اور منکرینِ خدا کو یا مسلمانوں کو بھی ؟ ؟ تو اس کا جواب بھی ہمیں قرآن مجید ہی سے مل جاتا ہے۔

(۱) چنانچہ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ نعمائے الٰہیہ ہونے کا اولین تقاضا اور اس کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ مسلمان اس سے فائدہ اُٹھائیں۔

(۲) پھر پچھلی فصل کی تمام آیتوں کا ایک اور مرتبہ جائزہ لیجئے تو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ خطا

---

[1] اللہ کے بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں اس کے طریقے سجھا دیتا ہے۔ جس کو اگر چاہا جائے تو تکوینی القاء کہا جاسکتا ہے۔

بالخصوص مسلمانوں ہی سے ہے۔ تو اس سے معلوم ہُوا کہ اس کُرۂ ارضی کی تمام اندرونی و بیرونی نعمتوں کے اصل مُستحق مسلمان ہی ہیں۔

(۳) اس کے علاوہ حسبِ ذیل نصوص تو اس باب میں فیصلہ کُن ہیں:

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعاً :

وہی ہے جس نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا کیں۔ (بقرہ : ۲۹)

نیز فرمایا:

هُوَ الَّذِىْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلاً فَامْشُوْا فِىْ مَنَاكِبِهَا وَ كُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ :

وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لئے رام کر دیا کہ چلو (پھرو) اس کے کندھوں پر اور کھاؤ اللہ کا رزق۔ (ملک : ۱۵)

نیز فرمایا: اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِىَ فِى الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهَارَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَاٰتٰكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ؕ

اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور بلندی سے پانی برسایا۔ پھر اس پانی کے ذریعہ تمہارے لئے میوے بطورِ رزق نکالے اور تمہارے لئے کشتیوں کو قابو میں کر دیا جو دریا (اور سمندر) میں اس کے حکم سے چلتی ہیں اور اسی نے تمہارے لئے نہروں کو مسخر کیا اور اسی نے تمہاری خاطر آفتاب و ماہتاب کو کام میں لگایا جو منظم طور پر چل رہے ہیں، اور اسی نے تمہارے لئے رات اور دن کو (بھی) مسخّر کیا۔ (غرض) اسی نے تم کو ہر وہ چیز عطا فرمائی جس کو تم نے چاہا (جن چیزوں کی تمہاری فطرت متقاضی ہوئی وہ تمام چیزیں اس نے عطا فرمائیں) اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار بھی کرنا چاہو تو

شمار نہ کرسکو گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی ناشکرا ہے۔ (ابراہیم: ۳۲-۳۴)

ان تمام آیاتِ پاک کا منشا و مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان دینی امور کی پابندی کے ساتھ ساتھ حدودِ الٰہی میں رہ کر زمین کے تمام خزانوں اور کائناتِ ارضی کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں اور صحیح معنی میں خلیفہ ارضی کے بمصداق دنیا کی امامت کی باگ ڈور سنبھالیں۔ مگر ان انعاماتِ الٰہی سے صحیح معنی میں فائدہ صرف اسی وقت اُٹھایا جاسکتا ہے جبکہ کائنات اور اس کے مظاہر کا صحیح علم بھی ہو اور ٹکنالوجی میں دسترس بھی۔ لہٰذا ان انعامات سے فائدہ اٹھانے کے لئے سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت حاصل کرنا ضروری ہے۔

اُمّت کا اجتماعی فریضہ

پھر ایک اور حیثیت سے غور کیجئے کہ مندرجۂ ذیل آیاتِ قرآنی کا مقصد کیا ہے؟

(۱) سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِى الْاٰفَاقِ وَفِىٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ : ہم اُن کو آفاق و انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ ان پر اس (کلامِ برتر) کی حقانیت واضح ہو جائے۔ (حٰم سجدہ: ۵۳)

(۲) وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا : کہہ دو کہ تعریف کا مستحق صرف اللہ ہے، جو تم کو عنقریب اپنی نشانیاں دکھا دے گا جن کو تم پہچان لوگے۔ (نحل: ۹۳)

(۳) خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُورِيكُمْ اٰيٰتِىْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ : انسان بڑا جلد باز پیدا کیا گیا ہے۔ عنقریب میں اپنی نشانیاں دکھا دوں گا۔ لہٰذا تم جلدی مت کرو۔ (انبیاء: ۳۷)

(۴) وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَاَىَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ : وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھا دے گا۔ پس تم اللہ کی کس کس نشانی سے انکار کروگے؟ (مؤمن: ۸۱)

ان چاروں مقامات میں دراصل ایک بہت بڑی پیشین گوئی کی گئی ہے کہ ہم اپنی صداقت اور ہمارے کلامِ برتر کی حقانیت کے واضح دلائل و نشانات (آفاقی و انفسی دلائل کی صورت میں)

مستقبل میں بھی ظاہر کر کے رہیں گے۔ ان آیات کا منشا و مقصد اور صاف و صریح اقتضاء یہ ہے کہ لوگ نظام کائنات میں تفکر و تدبر سے کام لیں اور سائنسی علوم کی ترقی ہو۔ ظاہر ہے کہ ان علوم کی ترقی کے بغیر وہ صداقتیں کیسے وجود میں آسکتی تھیں جن میں سے بعض نشانیوں کو آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور قیامت تک لوگ مزید آیات و نشانات کو دیکھتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ عظیم کے ذریعہ لوگوں کو ــ اور خصوصیت کے ساتھ اپنے وفاداروں کو ــ علوم جدیدہ کی تحصیل پر اُبھارا گیا ہے، جیساکہ " الذین یذکرون اللہ قیاما وقعودا وعلیٰ جنوبھم و یتفکرون فی خلق السمٰوٰت والارض (یہ آیت پہلے گزر چکی ہے) کے الفاظ صاف بتا رہے ہے کہ اس نظام کائنات میں تفکر و تدبر کرنے والے لوگ کون ہوسکتے ہیں ؟

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ دراصل اُمتِ محمدیہ پر ایک اجتماعی اور ملی فریضہ ہے کہ ان میں " اولوا الالباب " کا ایک طبقہ ضرور ہونا چاہیئے، جس کے حسبِ ذیل فرائض ہوں :

(۱) علومِ جدیدہ یا عصری علوم سے کما حقہ واقفیت حاصل کرے۔

(۲) نظامِ کائنات میں مجموعی حیثیت سے غور و فکر کرے۔

(۳) " آیاتِ الٰہی " پر خصوصی نظر رکھے۔

(۴) دلائلِ آفاق و انفس کا اخذ و استنباط کرتا رہے۔

(۵) اور اپنے نتائجِ فکر سے پوری اُمت کو آگاہ کرتا رہے۔

(۶) پھر ان آیاتِ الٰہی (دلائلِ آفاق و انفس) کی اشاعتِ عام سے پورے عالمِ انسانی کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے۔

ظاہر ہے کہ تمام لوگ نہ ان صفات سے متصف ہوسکتے ہیں، نہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر غور و فکر میں لگ سکتے ہیں۔ ہاں البتہ اُمتِ اسلامیہ میں ایک مخصوص طبقہ اس قسم کا ضرور ہونا چاہیئے ورنہ آیاتِ الٰہی کی حقانیت کا اثبات کیسے ہوسکے گا ؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اپنے اپنے زمانے کی معلومات کی بنا پر

ہر دور میں اس فن (آیاتِ الٰہی) پر خصوصیت کے ساتھ کتابیں تحریر کیں۔ چنانچہ اس موضوع پر امام غزالیؒ، امام رازیؒ اور علامہ ابنِ قیمؒ وغیرہ کی تصانیف میں بھی بہت سے مباحث مل جاتے ہیں۔ الغرض یہ وقت کا بہت بڑا اور اہم ملی فریضہ ہے جس سے چشم پوشی ملی موت کے مرادف سمجھی جائے گی۔

سائنس اور مسلمان

اس پوری بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ سائنس اور مذہب میں کسی بھی قسم کا تناقض یا منافات نہیں ہے بلکہ دونوں میں گہرا ربط و تعاون موجود ہے۔ نیز ان مباحث سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ سائنس مذہب پر حاکم یا فرمانروا نہیں بلکہ وہ درحقیقت مذہب کی معاون و مددگار ہے، اور یہ بات کسی اور مذہب پر صادق نہ آتی ہو۔ نہ آئے۔ مگر حقیقتاً مذہب اسلام کے بارے میں اس کی اصل پوزیشن یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے سائنس کے میدان میں نہایت شاندار ترقیاں کیں اور اس زمانے میں کیں جب کہ یورپ اپنی جہالت کے انتہائی تاریک ایام سے گزر رہا تھا۔ چنانچہ مسلمان علمائے سائنس نے اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں اور جدت طرازیوں کا بھی ایک قابلِ قدر نمونہ قائم کیا۔ وہ صرف روم و یونان کے قدیم سرمایۂ علم کے ناقل ہی نہیں تھے بلکہ اس میدان میں خود بھی علمی و تحقیقی حیثیت سے بہت سے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ چنانچہ انھوں نے اپنی محققانہ اور فکر انگیز تصانیف سے نہ صرف دمشق، بغداد اور قرطبہ وغیرہ کے کتب خانوں کو معمور کر دیا اور ایک نئے فکری انقلاب کی داغ بیل ڈالی بلکہ عملی حیثیت سے سائنس کے میدان میں نئی نئی تحقیقات اور نئے نئے تجربات و انکشافات کر کے پوری دنیا میں ایک ہلچل پیدا کر دی اور ایک تہلکہ مچا دیا۔ جس طرح آج ریڈیو اور ٹیلی ویژن یا کسی نئے سائنسی ایجاد کو دیکھ کر لوگ تعجب کا اظہار کرنے لگتے ہیں اسی طرح دورِ قدیم میں مسلمان سائنسدانوں کی ایجادات کو دیکھ کر عیسائی بادشاہ تک ورطۂ حیرت میں مبتلا ہو جاتے تھے۔

غرض مسلمان جب تک مسندِ حکومت پر فائز رہے، حکومت کی سرپرستی میں وہ اس میدان کے شہسوار رہے اور انہوں نے تمام اقوامِ عالم کو پیچھے چھوڑ کر اس میدان میں نہایت شاندار ترقیاں کیں۔

کلیسا کا رویہ اور اُس کے اثرات

یہاں پر یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے کہ یونانی فلسفہ کی ترویج و اشاعت کے باعث اسلام میں بہت سے فرقے پیدا ہوئے، طرح طرح کی اعتقادی گمراہیاں پھیلیں بلکہ ایک دوسرے کی تکفیر تک کی گئی، مگر فلسفہ کے برعکس سائنس اور سائنسی علوم کے خلاف کسی نے آواز نہیں اُٹھائی۔ یعنی کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ بات اسلام کے خلاف ہے جیسا کہ کلیسا والوں نے سائنس کو عیسائیت کے خلاف قرار دے کر خواہ مخواہ ہنگامہ مچایا اور ایک عالم کو مذہب سے برگشتہ کر دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ کے برعکس سائنسی علوم کی ترقی و ترویج و اشاعت سے خود مذہب کی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے اور نظامِ کائنات اور اس کے اصولوں سے شرک و بُت پرستی، الحاد و مادیت اور تشکیک و ارتیاب وغیرہ کے خلاف نہایت مؤثر اور سائنٹفک انداز میں استدلال کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔

چنانچہ پوری اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ علماء و حکمائے اسلام نے اس حیثیت سے اپنے اپنے زمانے کی معلومات کے مطابق بڑی خوبی کے ساتھ شرک و مادیت اور دیگر گمراہیوں کا رد و ابطال کیا ہے۔ اس کی ایک شاندار مثال تفسیرِ کبیر ہے جس میں بعض ایسے سائنٹفک مسائل تک مل جاتے ہیں جو موجودہ دور کی تحقیق سمجھے جاتے ہیں۔

اہلِ کلیسا نے حماقت یہ کی کہ مذہب اور سائنس کے اصل و بنیادی فرق کو نظر انداز کر کے ان دونوں کو یکساں درجہ دے دیا جس کے خوفناک نتائج رونما ہوئے اور اہلِ علم و اہلِ کلیسا کے درمیان کش مکش کا ایک ایسا المناک اور خونین سلسلہ چل پڑا جو بالآخر مذہب سے مکمل علیحدگی پر منتج ہوا۔ اس طویل کش مکش اور آویزش کے نتیجے میں موجودہ الحاد و مادیت نے جنم لیا جو درحقیقت کلیسا کی کوکھ سے نکلی ہے۔

آج الحاد و لادینیت اور تشکیک و ارتیاب وغیرہ گمراہیوں کا اگر علاج اور توڑ ہو سکتا ہے تو صرف اسلام اور اسلامی اصولوں ہی کی بدولت ہو سکتا ہے۔

اسلام کا احسان علمی دُنیا پر

یوں تو قرآن — یا اسلام — کے عالمِ انسانی پر بے شمار احسانات ہیں جن کا کریڈٹ

اسلام کو پہنچتا ہے، مگر علمی دُنیا پر اس کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ وہ دُنیا کے دیگر مذاہب کے برعکس علم ـــ مطلق علم، جس میں ہر قسم کے علوم شامل ہوسکتے ہیں ـــ کی اشاعت اور اس کی عالمگیر ترویج کا داعی رہا ہے۔ اور اسلام ہی کے طفیل اس کائناتِ ارضی پر علم کی روشنی پھیلی اور جہالت کا خاتمہ ہوسکا۔

لٰہذا اگر مذکورہ بالا مباحث اور ناقابلِ تردید حقائق کے پیش نظر یہ دعویٰ کیا جائے کہ سائنس کی ترقی بھی دراصل اسلام ہی کی مرہونِ منّت ہے تو یہ دعویٰ بلا مبالغہ ایک مبنی برحقیقت اور ناقابلِ تردید دعویٰ ہوگا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر اسلام علم و سائنس کی ترقی کا ذمہ نہ لیتا تو پتہ نہیں کہ موجود علمی ترقی تک پہنچنے کے لئے دُنیا کو مزید کتنی صدیاں طے کرنی پڑتیں۔

الغرض مسلمان جب تک مسندِ حکومت پر فائز رہے وہ برابر سائنس کے میدان میں بھی امامِ عصر رہے۔ کیونکہ سائنس کی ترقی و تحقیق حکومت کی امداد اور اس کے تعاون کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ اس کام کے لئے بڑے وسیع سرمائے، مسلسل تجربات، انتھک جدوجہد اور کُلّی فراغت وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر جب اس اُمتِ مرحومہ پر زوال آیا تو یہ ہمہ جہتی زوال ثابت ہُوا۔ اقوامِ عالم کی سیادت اور ان پر بالادستی کے ساتھ ساتھ علم و تحقیق کی امامت بھی ان سے چِھن گئی۔ اس لحاظ سے موجودہ دور میں سائنس کے میدان میں مسلم قوم کے دیگر اقوامِ عالم سے پیچھے رہ جانے کے اسباب تاریخی ہیں جس کے لئے قرآن یا اسلام قصوروار نہیں ہوسکتے۔ لٰہذا آج سائنس کا نام لے کر علمائے کرام کی مذمت کرنا یا سائنس کو اصل قرار دے کر احکامِ شریعت کا استخفاف کرنا کھلی ہُوئی نادانی بلکہ خود تاریخ سے جہل و ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا : تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس روشن حقیقتیں آچکیں۔ پس اب جس نے بصارت سے کام لیا وہ فائدے میں رہا اور جو اندھا بنا تو اس کا وبال اسی پر ہے۔ (انعام : ۱۰۵)

قرآن اور سائنٹفک حقائق

مذکورہ بالا تمام حقائق کے پیش نظر جب ہم قرآنِ حکیم میں غور کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ وہ بعض اوقات نظامِ کائنات کے ضمن میں یا اُن کی لپیٹ میں ـــ اشاروں ہی اشاروں میں ـــ

چند ایسے جُزئی حقائق بھی بیان کر دیتا ہے جو آگے چل کر ــــ یعنی سائنسی علوم کی ترقی کے بعد ــــ افکارِ انسانی کا ماحصل یا نتائجِ فکر ثابت ہو سکتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر وہ علمی انکشافات یا اسرارِ سربستہ جو جدید علوم کی ترقی کے بعد منظرِ عام پر آتے ہیں، ان کو ہم قرآن حکیم کی علمی پیشین گوئیاں کہہ سکتے ہیں جن کے ملاحظہ سے خلاّقِ فطرت کے علم ازلی کا بھی بَرملا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور ثابت ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک دراصل اسی ہستی کی طرف سے بھیجا ہُوا نوشتہ ہے جس نے اس عالم رنگ و بو کی تخلیق کی ہے۔ زیادہ تفصیل کی اس موقع پر گنجائش نہیں۔

قرآن پاک کا تاریخی کارنامہ اور جدید مفسّر کا فریضہ

نزولِ قرآن سے پہلے مظاہر کائنات سے متعلق لوگوں میں مشرکانہ توہمات پھیلے ہوئے تھے اور لوگ ان مظاہر کو دیوی دیوتا یا دیوی دیوتاؤں کے تابع تصور کرتے تھے، مثلاً چاند، سورج، ستارے، آگ، ہوا، پانی، حتیّٰ کہ شجر و حجر تمام مظاہر کائنات عام طور پر معبود و مسجود تصوّر کیے جاتے تھے۔ مشرکین کا فلسفہ یہ تھا کہ جس چیز سے ہم کو ذرا بھی نفع یا نقصان پہنچ سکتا ہو وہ قابلِ احترام اور لائق عبادت ہے۔

ان مشرکانہ عقائد کا ابطال اسلام سے قبل کسی بھی مذہب نے کھلے اور واضح طور پر اور دلائل کی روشنی میں نہیں کیا۔ حتیٰ کہ تورات و انجیل ــــ موجودہ بائبل ــــ میں بھی اس بارے میں کسی قسم کی واضح تردید موجود نہیں ہے۔

یہ صرف قرآنِ عظیم کا کارنامہ ہے کہ وہ علمی، عقلی اور سائنٹفک ہر قسم کے دلائل کی روشنی میں ان مظاہر کائنات کے الٰہ یا معبود یا دیوی دیوتا ہونے کا بھرپور ابطال کرتا ہے اور جگہ جگہ ان کے مخلوق و محکوم ہونے کا واضح انداز میں ذکر کرتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ وہ جہاں ایک طرف ان مظاہر فطرت کے مختارِ کل ہونے کے عقیدے پر ضرب لگاتا ہے تو دوسری طرف نوعِ انسانی کے لئے ان مظاہر کی تسخیر کا ذکر کر کے ان کے واقعی فوائد سے متمتع ہونے کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اس سے قرآن کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے مظاہر کائنات

کی ہیبت و دہشت نکل جائے اور وہ ان کو مسخر کر کے خلافتِ ارضی کے مقاصد کی تکمیل کر سکیں۔

یہی وہ صحیح اندازِ فکر تھا کہ مسلمان اپنے دورِ خلافت کی ابتدائی صدیوں ہی میں، نظامِ کائنات میں صحیح اور سائنٹفک طریقے سے غور و فکر کرنا شروع کر دیا۔ اقوامِ عالم کے بچے کھچے علمی سرمائے کا جائزہ لے کر نئے نئے علوم مدون کئے اور سائنس کے تمام شعبوں میں نمایاں ترقی کی۔ یہ واقعہ ہے کہ مسلمانوں سے قبل تمام سائنسی علوم محض نظری تھے جن کا مشاہدہ و تجربہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یونانی حکماء کے نظریات کی بنیاد زیادہ تر ہوائی قلعوں پر ہوا کرتی تھی۔ اہلِ اسلام نے سب سے پہلے صحیح اصول کے طور پر تحقیق و تدقیق کا مدار تجربہ و مشاہدہ قرار دیا جس کی بدولت علمی دنیا ایک نئے فکری انقلاب سے دوچار ہوئی۔ مادّہ و توانائی کے اسرار کھلنے لگے، ایجادات و انکشافات کا سلسلہ چل پڑا اور دُنیا علومِ جدیدہ سے روشناس ہونے لگی۔ علومِ جدیدہ کی داغ بیل دراصل مُسلمانوں ہی کی ڈالی ہوئی ہے جن سے آج مُسلمان ہی دُور بھاگ رہے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ قرآنِ حکیم جس توہم پرستی کی تردید کرتا ہے اور جن مظاہرِ فطرت کے خُدائی میں شریک وسہیم ہونے کی نفی کرتا ہے انہی مظاہرِ فطرت میں وہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور ان ہی مظاہر کو وہ "آیاتِ الٰہی" (نشانات و دلائل) یعنی رحمتِ خداوندی کے نشانات اور وجودِ الٰہی کے دلائل قرار دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم کا یہ وہ تاریخی کارنامہ ہے جس کی مثال پیش کرنے سے پورا انسانی لٹریچر عاجز ہے۔

نظمِ کائنات میں غور و فکر اور تفکر و تدبر کے باعث نہ صرف وجودِ خداوندی کا ثبوت ملتا ہے بلکہ ایک حیرت انگیز تنظیم و منصوبہ بندی، حکمت و مصلحت، خالقِ کائنات کی زبردست قوّت اور مخلوقات پر اس کی رحمت و رافت کے عجیب و غریب مظاہر بھی سامنے آتے ہیں۔ ان حقائق کے ملاحظہ کے بعد انکارِ خداوندی یا الحاد و لادینیت کے لئے قطعاً کسی قسم کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ ۝ وَفِي أَنفُسِكُمْ ۚ أَفَلَا تُبْصِرُونَ ؕ

اور (صفحۂ) ارض میں یقین کرنے والوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور خود تمہاری ہستیوں (تمہارے جسمانی و رُوحانی نظام) میں بھی۔ کیا تم کو نظر نہیں آتا ؟

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات حد درجہ بلیغ ہیں۔ ان کی تفصیل و تشریح میں دفتروں کے دفتر سیاہ کئے جا سکتے ہیں اور تمام علومِ جدیدہ کو زیرِ بحث لا کر "آیاتِ الٰہی" کی تحقیق و تدوین کی جا سکتی ہے۔ تاکہ منکرینِ حق کے لئے اتمامِ حجت کا سامان بن سکے اور قرآنِ حکیم کا منشا و مقصد پورا ہو۔ عصری علوم و فنون کو زیرِ بحث لانے کا فائدہ یہ ہوگا کہ ہر زمانے میں ایک نئے علمِ کلام کی تدوین عمل میں آئے گی اور ہر زمانے کے منکرین و معاندین پر اتمامِ حجت ہوتی رہے گی۔

یہی وجہ ہے کہ نبوت و رسالت کے انقطاع کے بعد یہ ذمہ داری علمائے اُمت پر ڈالی گئی ہے۔ اور قرآنِ حکیم کی آیات میں ایسی حیرت انگیز لچک اور وسعت رکھی گئی ہے کہ ان کی تشریح و تفسیر میں قیامت تک وجود میں آنے والے تمام جدید علوم و فنون کو زیرِ بحث لایا جا سکتا ہے۔ جب تک یہ کام نہیں ہوگا منکرین و معاندین پر حجت پوری نہیں ہوگی اور الحاد و لادینیت کا قلع قمع نہیں ہو سکے گا۔ حالانکہ قرآنِ حکیم صاف صاف کہتا ہے :

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ

۴۔ اجرامِ سماوی کا جغرافیہ اور رُبوبیت کے بعض اسرار

زمینوں کی کثرتِ تعداد

قرآنی نظریہ کے مطابق اس وسیع و عریض کائنات میں صرف ایک ہی زمین نہیں بلکہ ہمارے کُرّہ ارض کی طرح متعدد زمینیں موجود ہیں، جیساکہ ارشادِ باری ہے:

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا: اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور انہی کی طرح زمینیں بھی۔ ان (تمام اجرام) میں امرؐ (الٰہی) نازل ہو رہا ہے۔ (یہ کرشمے وہ اس لئے دکھا رہا ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور یہ کہ اللہ کا علم (کائنات کی) ہر چیز پر محیط ہے۔ (طلاق: ۱۲)

---

[1] یہاں پر امر سے مراد طبعی و فطری (تکوینی یا NATURAL) "اوامر" بھی ہو سکتے ہیں اور شرعی (MORAL) "احکامات" بھی۔ اور یہ لفظ ان دونوں امور کا جامع ہے۔ اور قرآن کے دیگر نصوص سے پتہ چلتا ہے کہ دوسری زمینوں میں بھی نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہے جیساکہ تفصیل اگلے صفحات میں آ رہی ہے۔

اس آیتِ پاک میں " مثلھن " کے الفاظ بہت زیادہ قابلِ غور ہیں۔ سوال یہ ہے کہ " مثل " سے کیا مراد ہے اور تشبیہ کس چیز میں دی گئی ہے ؟ تو اس کے حسبِ ذیل تین جواب ہوسکتے ہیں :-

(۱) سات آسمانوں کی طرح سات زمینیں پیدا کی گئی ہیں۔

(۲) متعدد آسمانوں کی طرح متعدد زمینیں پیدا کی گئی ہیں۔ یعنی اس صورت میں تشبیہ مطلق تعدد میں ہے اور کوئی متعین تعداد مراد نہیں۔

(۳) مثل کا تعلق خلق سے ہے۔ یعنی جس طرح اُس نے آسمان پیدا کئے ہیں اسی طرح زمینیں بھی پیدا کی ہیں۔

مگر حدیث شریف میں جو قرآن کریم ہی کی شرح وتفسیر ہے، صراحت موجود ہے کہ سات آسمانوں ہی کی طرح سات زمینیں بھی موجود ہیں. مثلاً ترمذی کی ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام کے سامنے سات آسمانوں کا تذکرہ کیا جو ایک کے اوپر ایک واقع ہیں. اور ہر دو کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے. اسی طرح ایک کے نیچے ایک سات زمینیں بھی موجود ہیں، جن میں سے ہر دو کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔ (جامع الاصول : ۲۲/۴)

مگر اس موقع پر پانچ سو سال کی مسافت کے جو الفاظ استعمال کئے گئے ہیں وہ غالباً بے انتہا دوری کی تعبیر کی خاطر ہوں گے۔ یا پھر اس کا مطلب موجودہ "نوری سال" کے پیمانے سے زیادہ سریع الحرکت کوئی " فوق الطبیعی " پیمانہ ہوگا۔

غرض ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب عالمِ ارواح میں تمام انسانوں سے "عہدِ الست" لیا تھا تو اُس موقع پر فرمایا : " میں تم پر ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کو شاہد بناتا ہوں " (مسند احمد : ۱۳۵/۵)

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ جس شخص نے (دنیا میں) ایک بالشت بھر زمین بھی ظلم کے طور پر لے لی ہو تو اس کو قیامت کے دن سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔ (بخاری، کتاب بدء الخلق)

اس طرح کی اور بھی حدیثیں ہیں، جن سے سات زمینوں کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔
اس لحاظ سے اس مفہوم سے ہٹ کر کوئی دوسرا مفہوم اخذ کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک اہم سوال یہ ہے کہ یہ زمینیں کہاں ہیں؟ آیا ہمارے ہی نظامِ شمسی میں یا دیگر ستاروں (STARS) کے شمسی نظاموں میں؟ تو اگرچہ اس باب میں قوی امکان یہی ہے کہ یہ زمینیں دیگر شمسی نظاموں میں پائی جاتی ہوں گی، مگر یہ بھی ممکن ہے کہ خود ہمارے نظامِ شمسی میں ہماری زمین کے علاوہ بھی کوئی ایسا تابع سیارہ موجود ہو جو آبادی کے لئے موزوں ہوسکتا ہو۔ تعددِ ارض کی بحث میں مولانا اشرف علی تھانوی نے بھی یہی مراد لیا ہے کہ اس سے مراد دیگر سیارے ہوں گے۔ (ملاحظہ ہو "صدق جدید" ۱۳ رمئی ۱۹۶۰)

اصل میں لغوی اعتبار سے "ارض" کا اطلاق رُوئیدگی اور سبزہ زاروں سے لبریز مقام پر ہوتا ہے:

اَرِضَ يَأْرُضُ أَرْضاً (المكان) كَثُرَ عُشْبُهُ وَازْدَهىٰ وَحَسُنَ فِي الْعَيْنِ: یعنی کسی جگہ کا سبزہ سے بھرپور، پُررونق اور خوش منظر ہونا۔ (المنجد)

اس موقع پر ایک سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری کائنات میں کہکشاؤں (GALAXIES) کی تعداد اربوں تک پہنچ چکی ہے، اور خود ایک ایک کہکشاں میں لاتعداد ستارے (STARS) موجود ہیں تو پھر زمینیں صرف سات ہی کیوں؟ تو اس کا جواب دینا ابھی قبل از وقت ہوگا۔ کیونکہ اب تک سائنسی نقطۂ نظر سے ہماری زمین کے سوا کسی بھی دوسرے سیارے (PLANET) میں "زندگی" کا وجود ثابت نہیں ہے، اگرچہ امکانات تو تسلیم کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ سوال اُس وقت پیدا ہوگا جب خود سائنس سات سے زیادہ اجرام یا کُرّوں میں زندگی کا وجود ثابت کردے۔ اس لحاظ سے موجودہ حالات میں تو ہمیں سائنس سے زیادہ قرآن اور حدیث "ترقی یافتہ" (ADVANCED) نظر آتے ہیں۔ اور سائنس جب مزید آگے نکل جائے گی تو وہ اور زیادہ ترقی یافتہ نظر آئیں گے۔ (انشاءاللہ العزیز)

جیسا کہ اس مضمون کے مندرجات اور انکشافات سے ظاہر ہوگا جدید سائنس تو اس باب میں اب تک چناں و چنیں کی حالت میں ہے۔ جب کہ قرآن اور حدیث میں اس بارے میں نہایت درجہ

قطعیت کے ساتھ بہت سے اُمور کا اثبات اور بہت سے طبیعی (PHYSICAL) مسائل کا حل نظر آتا ہے۔

اجرامِ سماوی میں زندگی

بہرحال قرآن حکیم میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ ہماری زمین ہی کی طرح بہت سے اجرام سماوی میں بھی ہر قسم کے جاندار پائے جاتے ہیں۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ

اور اس کے (وجود کے) دلائل و نشانات میں سے ہے یہ بات کہ اس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور ان میں (ہر قسم کے) جاندار پھیلا دیئے۔ (شوریٰ : ۲۹)

اس آیتِ کریمہ میں جن اجرام کو "سماوات" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، انہی اجرام کو سورۂ طلاق کی مذکورۂ بالا آیت میں "زمینوں" کے لفظ سے موسوم کیا گیا ہے۔ (واضح رہے کہ لفظ ارض اسم جنس بھی ہے) اس لحاظ سے ہر "اُوپری زمین" نیچے والوں کے لئے بمنزلہ سماء (اوپری منزل) کے ہے۔ اگرچہ اس کا اطلاق خود اس کی اپنی اُوپری منزل کے لحاظ سے اپنی جگہ پر "ارض" ہی پر ہوتا ہو۔ گویا کہ ہر زمین ایک حیثیت سے ارض بھی ہے اور دوسری حیثیت سے سماء بھی۔

مگر تعجب ہوتا ہے کہ موجودہ سائنسی دَور سے صدہا سال قبل (بارھویں صدی عیسوی میں) مولانا رومؒ ان تمام حقائق کا ادراک کیسے کر چکے تھے! چنانچہ آپ فرماتے ہیں :۔

زرد با نہائیست پنہاں در جہاں　　پایہ پایہ تا عنان آسماں
ہر گرہ را زرد بانے دیگر است　　ہر زمیں را آسمانے دیگر است[1]

اجرامِ سماوی کے اختلافات

یہ بات خوب سمجھ لینی چاہئے کہ قرآن مجید دیگر سیاروں یا اجرام سماوی میں ہر قسم کی زندگی کے وجود کا قائل ہے، تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ تمام سیاروں پر بلا استثناء لازمی طور پر ہر قسم کی

---

[1] اس سے بطلیموسی نظریہ کی تردید بھی نکلتی ہے کہ تمام اجرام سماوی آسمان میں جڑے ہوئے ہیں۔

زندگی موجود بھی ہوگی۔ جاندار مخلوق کا وجود دراصل کسی سیارے کے طبعی وفطری (NATURAL) احوال وکوائف پر منحصر ہے۔ لہٰذا ہوسکتا ہے کہ کسی سیارے پر زندگی کے آثار ومظاہر پائے جائیں، جیسے کرۂ ارض، اور کسی پر نہ پائے جائیں جیسے کرۂ قمر۔ اسی طرح کسی سیارے پر حیات کے ابتدائی مظاہر پائے جائیں تو کسی پر ترقی یافتہ۔

غرض حسب ذیل آیتِ کریمہ میں اجرام سماوی کے طبعی حالات وکیفیات کے انہی تمام اختلافات کی طرف اشارہ ہے:۔

فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا :

پس اُس نے دو دِن (دو مرحلوں) میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں (اس کے حالات ومقتضیات کے مطابق) اس کا معاملہ پہنچا دیا۔ (حٰمٓ۔سجدہ : ۱۲)

اس آیتِ پاک میں معاملہ (امر) مطلق صورت میں نہیں بلکہ "اس کا معاملہ" (امرھا) اضافت کے ساتھ مذکور ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ ہر ایک آسمان (اربوں کہکشاؤں و اَن گنت ولاتعداد ستاروں STARS اور سیاروں PLANETS پر مشتمل) اور ہر ایک آسمان کے تحت آنے والے اجرام کے معاملات مختلف ہوا کرتے ہیں اور خُدا کا حکم ہر ایک جہان کے طبعی وفطری حالات کے مُطابق مختلف ہُوا کرتا ہے۔

نیز اس آیت میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مختلف سیاروں کی مخلوقات کی شکل وصورت، چہرہ مہرہ، رنگ ڈھنگ اور چال ڈھال میں بھی اختلاف ہوسکتا ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ شہابوں۔ جو دراصل اجرام سماوی ہی کے ٹکڑے ہیں۔ کے کیمیائی تجزیہ سے پتہ چلا ہے کہ ان کائناتی پتھروں کے بنیادی اجزاء (ELEMENTS) تو بالکل وہی ہیں جو ہماری زمین کے اجزاء (۹۲ عناصر) ہیں۔ مگر ان شہابوں کے مرکبات (COMPOUNDS) اور ہماری زمین کے مرکبات میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا ان اجرام میں آباد شدہ مخلوق کی جسمانی ساخت وکیفیت میں بھی اسی قسم کا اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ یوں

سمجھئے کہ کسی دو زبانوں میں باوجود بعض حروفِ تہجی اور ان کے صوتی لہجوں میں اشتراک ہونے کے ان کے الفاظ و کلمات کی شکل وصورت میں کوئی یکسانیت وہم آہنگی نہیں پائی جاتی، مثلاً اُردو اور انگریزی یا جرمن اور سنسکرت وغیرہ۔ یہی حال تمام جہانوں کے مادی مظاہر، ان کے اشکال و الوان، ان کی ساخت و ترکیب اور ان کی تمام حیاتیاتی بوقلمونیوں کا بھی ہے۔

بنیادی عناصر کے اشتراک کے باوجود ان کے مرکبات کی یہ رنگارنگیاں دراصل قدرتِ خُداوندی کا بڑا زبردست مظاہرہ ہیں، جس سے اس کی وحدت و یکتائی کا بھی بڑا اچھا ثبوت ملتا ہے، اور شرک و توہم پرستوں کی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ تمام جہانوں کی تشکیل اور ان کی حیرت انگیز نیرنگیوں میں وہی ۹۲ عناصر پائے جاتے ہیں، جو ہماری زمین پر موجود ہیں گویا کہ کُل جہانوں پر ایک ہی زبردست و عظیم فرماں روا کی حکمرانی و قہرمانی چل رہی ہے اور تمام اجرام سماوی ایک زبردست ہستی کی ربوبیت اور نگرانی کے ماتحت رَواں دَواں ہیں اور اس کائنات گیر بادشاہت میں کوئی دوسرا اس کا شریک و سہیم نظر نہیں آتا۔

زمین اور چاند کے اختلافات

بہرحال جدید خلائی پروازوں کے نتیجے میں جغرافیائی حیثیت سے زمین اور چاند کے اختلافات کھل کر سامنے آگئے ہیں، جو اجرام سماوی کے اختلافاتِ باہمی پر ایک مزید ثبوت ہے۔ مثلاً چاند پر ہوا، پانی، آکسیجن، پیڑ پودے اور حیوانات وغیرہ کا وجود نہیں ہے، جو ہماری زمین پر بافراط پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حسبِ ذیل آیات حد درجہ بلیغ اور معنی خیز ہیں :-

وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ : اور زمین میں تمہارے لئے ایک وقتِ خاص تک جائے قرار اور سامانِ زندگی رکھا گیا ہے۔ (اعراف: ۲۴)

وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ : اور ہم نے زمین پر تمہارے قدم جمائے ہیں اور اس میں تمہارے لئے (ہر قسم کے) ذرائع معاش (جو تمہاری زندگی کے لئے ضروری ہیں) ودیعت کر دیئے ہیں (مگر اس کے باوجود)

تم بہت کم شکر گذار ہو۔ (اعراف : ۱۰)

اُوپر کی دونوں آیتیں ایک دوسرے کی تشریح و تفسیر کر رہی ہیں۔ چنانچہ پہلی آیت میں "مستقر و متاع" کے الفاظ لائے گئے ہیں، جن کی توضیح دوسری آیت میں بالترتیب تمکین (مکّنکم) اور معائش سے کی گئی ہے۔ تمکین کے معنی ہیں: کسی چیز کو ٹھہرانا، قدم جمانا اور قوت و اقتدار عطا کرنا وغیرہ۔

اب اس "تمکین فی الارض" میں کششِ ارض (GRAVITY) اور کُرۂ ہوا (ATMOSPHERE) کا دباؤ وغیرہ سب کچھ آجاتا ہے، جس کے باعث زمین ہمارے لئے "مستقر" (قرار گاہ) بن جاتی ہے۔ اسی طرح "معائش" (ذرائع معاش) میں ہوا، پانی، آکسیجن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، پیڑ پودے، قسم قسم کے حیوانات اور دیگر تمام لوازمات بخوبی آجاتے ہیں، جو ہمارے لئے "متاع" (سامانِ زندگی) بن سکتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دو الفاظ میں رموز و اسرار کا ایک دریا موجزن ہے۔

پھر دوسری حیثیت سے ہماری زمین کی سطح کے برعکس چاند کی سطح بالکل کٹی پھٹی اور ہزاروں شگافوں اور گہری کھائیوں سے لبریز ہے۔ چاند کے خلا بازوں نے وہاں سے مٹی اور پتھروں کے جن نمونوں کو لایا ہے، وہ بھی ہماری زمین پر پائے جانے والے نمونوں سے بالکل مختلف ثابت ہوئے ہیں۔ اور آیتِ ذیل میں کُرۂ ارض اور اجرامِ سماوی کے انہی تمام نیرنگیوں کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ : بیشک زمین اور اجرامِ سماوی میں ایمان لانے والوں کے لئے واضح نشانات و دلائل موجود ہیں۔ (جاثیہ : ۳)

اس سے جہاں پر بہت سے حقائق اُجاگر ہوتے ہیں، وہاں پر ایک خاص سبق ابطالِ شرک کا بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ گزر چکا کُل کائنات پر ایک عظیم فرماں روا کی حکمرانی چل رہی ہے۔ اب اس کا مزید ثبوت یہ ہے کہ چاند کی مٹی — جس کو خلا باز اپنے ساتھ لائے ہیں — زمینی تخموں اور پودوں کے نشو و نما کے لئے بڑی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔ لہٰذا زمین اور چاند کا — اپنے طبعی و فطری اختلافات کے

باوجود — یہ توافق یا "امداد باہمی" وحدتِ خدائی کی بڑی شاندار دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس دھرتی کا "دیوتا" کوئی اور ہوتا، اور چاند کا "دیوتا" کوئی اور، تو پھر یہ بے نظیر توافق و ہم آہنگی ہرگز نہ پائی جاتی۔

کلماتِ الٰہی کی ہمہ گیری

کرۂ ارض اور اجرامِ سماوی کے یہ تمام اختلافاتِ باہمی "امرھا" (حٰم سجدہ: ۱۲) کے مطابق محض ایک ضمیر "ھا" کا کرشمہ ہے، جس کی تفسیر میں پوری کائنات کے جغرافیہ کو پیش کیا جا سکتا ہے یعنی تمام اجرامِ سماوی (اربوں کہکشاؤں میں پھیلے ہوئے اَن گنت و لاتعداد ستارے و سیارے، جو جدید فلکی تحقیقات کے مطابق ایک ایک کہکشاں میں کم از کم ایک کھرب ہوتے ہیں) کی تمام جغرافیائی تفصیلات اس "ھا" کے دو حرفی کوزے میں سما جاتی ہیں۔ گویا کہ اس وسیع و بیکراں کائنات کے کل جغرافیہ کو محض ایک دو حرفی لفظ میں سمو دیا گیا ہے، اور انسان اس کائنات کا جغرافیائی حیثیت سے مکمل سروے کر کے اس "ھا" کی پوری پوری تفسیر کبھی نہیں کر سکتا۔ یہی وہ سرمدی حقیقت ہے جس کی نقاب کشائی حسبِ ذیل آیتِ کریمہ میں کی گئی ہے:-

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا : کہہ دو کہ میرے رب کی باتوں (کی تفسیر) کے لئے اگر سمندر بھی روشنائی بن جائے تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے ہی سمندر ختم ہو جائے گا، اگرچہ ہم اس کی مدد کے لئے مزید ایک سمندر لے آئیں۔ (کہف: ۱۰۹)

نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے:-

وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ : اور اگر زمین میں جتنے بھی درخت ہیں ان کے قلم بن جائیں، سمندر (کا پانی روشنائی بن جائے، جس کے بعد) مزید سات سمندر لے لئے جائیں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اللہ تو بڑا ہی غالب اور دانا بینا ہے (جس کی تخلیقات متنوع و منفرد ہو کر ایک نرالی امنگ بن کر ابھرتی ہیں) (لقمان: ۲۷)

پانی اور دیگر لوازماتِ زندگی

اَجرام سماوی کے متعلق مذکورۂ بالا بنیادی ہمہ گیر کلیہ (طبعی و فطری احوال و کوائف کا باہمی اختلاف) کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب حسب ذیل آیتِ کریمہ کا مطالعہ کیجئے جس میں ربوبیت کے دو اہم ترین رازوں کو بے نقاب کر دیا گیا ہے :-

وَاللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى رِجْلَيْنِ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰٓى اَرْبَعٍ يَخْلُقُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : اور اللہ ہی نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا، جن میں سے کوئی پیٹ کے بل چلتا ہے (جیسے حشرات)، کوئی دو پیروں پر چلتا ہے (جیسے انسان اور پرندے) اور کوئی چار پاؤں پر چلتا ہے (یعنی چوپائے)۔ اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ (چار پیروں سے زائد بھی عطا کر سکتا ہے)۔ یقیناً اللہ ہر چیز (کے پیدا کرنے) پر قادر ہے۔ (نور : ۴۵)

اس آیتِ کریمہ میں اصولی حیثیت سے " دابّہ " کی فلسفیانہ تقسیم کی گئی ہے یعنی " دابّہ " کا اطلاق انسانوں کے علاوہ چرندوں، پرندوں، درندوں اور ہر قسم کے حشرات پر ہوتا ہے۔ یہ ایک کُلیہ ہُوا۔ اور دوسرا کلیہ یہ بیان کیا گیا کہ ان تمام " انواعِ حیات " کی تخلیق پانی سے ہوئی ہے، یعنی آغازِ حیات کی رُو سے بھی، نطفہ سے وجود میں آنے کے لحاظ سے بھی، تخمرمایہ (PROTOPLASM) کا بنیادی جزو ہونے کی حیثیت سے بھی اور خود پوری زندگی کا دارومدار پانی پر ہونے کی رعایت سے بھی۔ غرض جس حیثیت سے بھی نظر ڈالی جائے یہ ایک سائنٹفک اور صداقت سے بھرپور کُلیہ نظر آتا ہے۔ اس لحاظ سے پانی " دابہ " کی زندگی اور اس کے وجود کے لئے جزوِ لاینفک کی حیثیت رکھتا ہے۔ اب " دابہ " جہاں بھی ہو وہاں پر پانی کا پایا جانا ضروری ہے۔ اور پانی کے ساتھ ہی دیگر تمام لوازمِ حیات (پیڑ پودے وغیرہ) بھی آدھمکتے ہیں۔ اب چونکہ زمین اور اجرام سماوی دونوں میں " دابہ " کا وجود مشترک ہے، اس لئے وہاں پر پانی اور دیگر لوازمِ حیات

کا ہونا ضروری ہے اور جن اجرام میں دابہ، پانی اور دیگر لوازم حیات پائے جاتے ہوں، ان تمام کو ابتدائی آیات کی تشریح کے مطابق "ارض" سے موسوم کیا جا سکتا ہے، گویا کہ اس وسیع کائنات میں بے شمار "زمینیں" موجود ہیں۔

اجرامِ سماوی میں پانی

حاصل یہ کہ چونکہ حسبِ ذیل آیت کے مطابق دیگر سیاروں میں بھی "دابہ" کا وجود پایا جا رہا ہے اس لئے وہاں پر بھی پانی کا وجود لازمی ہے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ :

اور اس کے نشانات میں سے ہے زمین اور (اجرام) سماوی کا پیدا کرنا اور ان جانداروں کا پھیلانا۔ (شوریٰ: ۲۹)

واضح رہے کہ "دابۃ" لغت کی رو سے چلنے پھرنے اور رینگنے والے جانور کو کہتے ہیں، کیونکہ دَبَّ، یَدُبُّ کے معنی رینگنے کے ہیں۔ اور دابۃ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ (یعنی چلنے والا) جس میں تاء وحدت کی ہے۔ مگر ائمۂ لغت کی تصریح کے مطابق اس کا اطلاق عموماً ہر قسم کے جانداروں پر ہوتا ہے اور سورۂ نور کی مذکورۂ بالا آیت بھی اس پر بخوبی روشنی ڈال رہی ہے۔ اس لحاظ سے دابۃ کا اطلاق یک خلوی (UNICELLULAR) جاندار (مختلف قسم کے جراثیم مثلاً ایبا اور بکٹیریا وغیرہ) سے لے کر ایک بڑے سے بڑے جاندار مثلاً ہاتھی اور وھیل وغیرہ ہر ایک پر ہو سکتا ہے۔

غرض مذکورۂ بالا تصریحات کے مطابق ماء اور دابہ یا پانی اور جاندار لازم وملزوم ہیں جن میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس کی تائید حسبِ ذیل آیات سے بھی ہوتی ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ : کیا ان منکرینِ خدا نے مشاہدہ نہیں کیا کہ (ابتداءً) زمین اور اجرام سماوی آپس میں ملے ہوئے تھے؟ (یعنی ان تمام کا مادہ باہم گتھا ہوا تھا جیسا کہ سائنٹفک نظریہ ہے) پس ہم نے ان کو بکھیر دیا۔ (یعنی ان کے مادہ کو منتشر کر دیا، جس کے نتیجے میں مختلف کُرے بن گئے)۔ اور ہم نے پانی ہی سے ہر زندہ چیز کی تخلیق

کی ہے۔ تو کیا یہ منکرین ایمان نہیں لائیں گے ؟ (انبیاء : ۳۰)

یہاں پر قابلِ غور بات یہ ہے کہ زمین کے ساتھ ساتھ اجرامِ سماوی کی تخلیق کا تذکرہ بھی موجود ہے، جس کے معاً بعد صاف صاف تصریح کر دی کہ "زندگی" یا "زندہ شے" (ہر قسم کا پروٹوپلازم خواہ وہ حیوانات کا ہو یا نباتات کا[1]، جس کا اکثر حصّہ پانی ہی پر مشتمل ہوتا ہے) محض پانی ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہُوا کہ ہماری زمین کی طرح دیگر اجرامِ فلکی کے تمام جانداروں کی آفرینش میں پانی ایک بنیادی عنصر اور لازمی جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

واضح رہے کہ سورۂ نور کی آیت "خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ" (اُس نے ہر جاندار کو پانی سے پیدا کیا ہے) کے مطابق اس بات کا احتمال تھا کہ چونکہ لفظ "کُل" کا اطلاق کبھی کبھی "اکثریت" کے لئے بھی بول دیا جاتا ہے (استقراءِ ناقص کے طور پر) لہٰذا ہو سکتا ہے کہ بعض دابہ اس ہمہ گیر قاعدہ سے مستثنیٰ بھی ہوں، یعنی بعض کی تخلیق پانی سے نہ ہُوئی ہو۔ مگر زیرِ بحث آیت نے یہ احتمال دُور کرتے ہُوئے پوری صراحت کر دی کہ ہر جاندار "پانی ہی سے" پیدا کیا گیا ہے، جس میں کوئی استثناء نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر "من الماء" (متعلق فعل) کو "کل شیء حی" (مفعول بہ) پر مقدم رکھا گیا ہے۔ اور عربی زبان میں قاعدہ ہے کہ جس بات پر زور دینا مقصود ہو، ترتیب میں اس کو مقدم رکھا جاتا ہے، جیسے "اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ" میں۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ یہاں پر حصر کا یہ فائدہ ضمیر "ایاك" کو مقدم رکھنے کے باعث حاصل ہو سکا ہے، ورنہ سادہ صورت (نَعْبُدُكَ وَنَسْتَعِيْنُكَ) میں یہ فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ حاصل یہ کہ پانی سے تمام انواعِ حیات کا وجود میں آنا ایک ہمہ گیر کلیۂ قانونِ قُدرت ہے، جس میں کوئی استثنا نہیں ہے، خواہ

---

[1] حیوانات کی طرح نباتات کے اجسام بھی چھوٹے چھوٹے خانوں سے مرکب ہوتے ہیں، جن کو خلیات (CELLS) کہا جاتا ہے۔ انہیں خلیات میں ایک زندہ متحرک مادہ بھرا رہتا ہے جس کو نخزمایہ (پروٹوپلازم) کہتے ہیں اور قرآن شریف کے الفاظ "کل شیٔ حی"۔ بڑے بلیغ ہیں، جن کا اطلاق ہر قسم کے پروٹوپلازم پر ہو سکتا ہے، یعنی یہاں پر بجائے "جاندار" (دابہ) کہنے کے "زندہ شی" کہا گیا ہے تاکہ یہ نباتات پر بھی مشتمل ہو جائے۔

یہ جاندار کرۂ ارض پر پائے جائیں یا اجرامِ سماوی پر۔

ربوبیت کے مظاہر

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر ارشادِ ربانی ہے :-

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ. وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ. فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ لَّكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ. وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَاءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهَا وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ : اور

ہم نے تمہارے اوپر سات راہیں (سات آسمان) پیدا کر دئے ہیں، اور ہم (اپنی) مخلوق سے (جو ان ساتوں آسمانوں اور ان کے تحت آنے والے مختلف اجرام میں پھیلی ہوئی ہے) غافل نہیں ہیں، اور ہم نے آسمان سے ایک معین مقدار میں پانی برسایا، پھر اس کو زمین میں ٹھیرایا۔ اور اس پانی کو ہم غائب بھی کر سکتے ہیں۔ پھر ہم نے اسی پانی سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے اور تمہارے لئے ان باغوں میں (دوسرے) بہت سے پھل بھی مہیا کئے۔ اور تم ان باغوں میں کھاتے ہو۔ (اس کے علاوہ) ہم نے ایک اور درخت (زیتون) بھی اُگایا ہے جو طُورِ سیناء میں اُگتا ہے۔ وہ تیل اور کھانے والوں کے لئے سالن لے کر برآمد ہوتا ہے۔ اور یقیناً تمہارے لئے چوپایوں میں بھی ایک بڑا سبق موجود ہے۔ (چنانچہ) ہم ان کے پیٹ میں موجود (مخلوط) چیزوں میں سے (ایک خاص چیز یعنی دُودھ ایک حیرت انگیز طور پر نکال کر) تمھیں پینے کے لئے دیتے ہیں۔ اور تمہارے لئے ان چوپایوں میں بہت سے فوائد بھی ہیں اور تم انہیں کھاتے بھی ہو۔ اور ان چوپایوں پر اور کشتیوں پر سوار بھی کئے جاتے ہو۔ (مومنون : ۱۷-۲۲)

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا ایک نظارہ اور اس کی مخلوق پروری کا ایک منظر۔ یہ

بڑا ہی حکیمانہ اور بلیغ اندازِ بیان ہے جو اشاروں ہی اشاروں میں اسرارِ کائنات کو کھول کر رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ یہاں پر سات آسمانوں کا ذکر کر کے نمونے کے طور پر صرف ہمارے کرۂ ارض کے سامانِ معیشت کی تفصیل کی گئی ہے۔ یہ سیاق صاف صاف اس بات کی نشان دہی کر رہا ہے کہ دوسرے جہانوں میں بھی ــ جہاں دابّہ موجود ہو ــ اسی قسم کا یا اس سے ملتا جلتا "نظامِ ربوبیت" کارفرما ہے۔ اور خود "وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ" (اور ہم اپنی مخلوق سے غافل نہیں ہیں) کا مقتضا بھی یہی ہے۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ قرآنِ حکیم میں اسرارِ کائنات اور رازہائے ربوبیت کا بیان عموماً اشاروں، کنایوں کی زبان میں بیان کیا جاتا ہے، تاکہ سائنسی نقطۂ نظر سے چودہ سو سال پہلے کی غیر ترقی یافتہ اقوام کو کوئی الجھن بھی نہ ہو اور وقت آنے پر یہ حقائق غور و خوض کی بدولت بے نقاب بھی ہو جائیں۔

اجرامِ سماوی میں دُھوپ چھاؤں

حسبِ ذیل آیۂ کریمہ اس رازِ نہاں پر سے پردہ اُٹھا رہی ہے کہ مختلف اجرامِ سماوی میں جو زندگی کے مظاہر سے مالا مال ہوں، دھوپ اور سایہ کا نظام بھی کارفرما ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر جہاں کے لئے ایک سورج بھی ہوتا ہے۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ : زمین اور آسمانوں میں جو کوئی بھی ہے (سب کے سب) خوشگواری یا ناگواری کے ساتھ صبح شام اللہ ہی کے آگے سجدہ ریز ہیں اور ان کے سائے بھی سربسجود ہیں۔ (رعد: ۱۵)

یہاں پر سائے (ظلال) کے لفظ سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ اجرامِ سماوی میں بھی دھوپ چھاؤں موجود ہے، جو بغیر کسی سورج کے ممکن نہیں۔ اس سے پچھلے صفحات میں مذکور اس نظریہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ ہر نظامِ شمسی میں کوئی نہ کوئی ایسی "زمین" بھی ہوگی جو گرمی و سردی کے لحاظ سے معتدل اور زندگی کے لئے سازگار ہو، جیسے ہماری زمین جو نہ تو عطارد اور زہرہ کی طرح بے انتہا

گرم ہے اور نہ مریخ، مشتری اور نیپچون و پلاٹو کی طرح بے انتہا سرد۔[1]

ایک ترقی یافتہ مخلوق

سائنس دان اب تک اجرام سماوی میں زندگی کے وجود یا عدم وجود پر کسی قطعی رائے پر نہیں پہنچ سکے ہیں۔ بلکہ آئے دن اس میں تضاد بیانی کا مظاہرہ ہوتا رہتا ہے، ٹھیک ہے۔ انسان کا علم ہے ہی کتنا کہ وہ بغیر کسی رویت و مشاہدہ کے لاکھوں، کروڑوں اور اربوں، کھربوں میل دُور بیٹھ کر کسی بات کا حتمی و یقینی فیصلہ کر دے۔ اس کی ساری تگ و دو محض اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوگی۔ اب ظاہر ہے کہ اس کا فیصلہ صرف وہی کر سکتا ہے جس کا علم تمام جہانوں اور تمام زمانوں پر محیط ہو۔ بہرحال قرآن عظیم کے ذریعہ چودہ سَو سال قبل ہی یقینی و حتمی طور پر یہ اعلان و انکشاف کیا جا چکا ہے کہ ہماری زمین ہی کی طرح بہت سے سیاروں پر بھی نہ صرف ہر قسم کے جانداروں کا وجود پایا جاتا ہے بلکہ وہاں پر عقل و شعور کی قوتوں سے متصف ایک ترقی یافتہ مخلوق بھی موجود ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ : اور اس کے نشانہائے (وجود) میں سے ہے یہ بات کہ اُس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور ان میں (ہر قسم کے) جاندار پھیلا دئے، اور اس کو اس بات کی قُدرت حاصل ہے کہ وہ جب چاہے انہیں (کسی ایک مقام پر) اکٹھا کر دے۔ (شوریٰ: ۲۹)

اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَلْيَرْتَقُوْا فِى الْاَسْبَابِ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ : کیا ان لوگوں کو زمین، آسمانوں اور ان دونوں کے درمیانی مظاہر (فضاؤں اور خلاؤں) پر قابو حاصل ہو چکا ہے؟ اگر یہ بات ہے تو وہ رسیوں کے ذریعہ اُوپر چڑھ جائیں۔ یہ ایک حقیر سا لشکر ہے جو وہاں (دیگر

---

[1] مگر قدرتِ خداوندی سے یہ بات بعید نہیں ہے کہ گرم و سرد سیاروں میں بھی وہاں کی آب و ہوا برداشت کر سکنے والی کوئی عجیب و غریب مخلوق بھی پائی جاتی ہو۔

اجرامِ سماوی پر) موجود فوجوں سے شکست کھا جائے گا۔ (ص : ۱۰-۱۱)

چنانچہ سورہ شوریٰ والی آیت کے مطابق "جمعهم" میں "هم" کا لفظ اسمِ ضمیر (PRONOUN) ہے، جو ذوی العقول کے لئے لایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اجرامِ سماوی میں موجود "دابہ" (ہر قسم کے جانداروں) میں بعض صاحبِ عقل و شعور ہستیاں بھی موجود ہیں، جس طرح کہ خود ہمارے کُرۂ ارض پر پائی جاتی ہیں۔ انہی صاحبِ عقل و شعور ہستیوں کو سورہ صٓ والی آیت میں "احزاب" (جماعتیں، فوجیں، بڑے بڑے گروہ) کہا گیا ہے۔ کیونکہ "اَلْقُرْآنُ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضاً" کے اُصول کے مُطابق قرآن کے بعض مقامات کی تشریح و توضیح اس کے بعض مقامات سے ہو جاتی ہے۔

بہرحال "احزاب" کا لفظ اجتماعی تنظیم پر بھی دلالت کر رہا ہے، جس سے منکشف ہوتا کہ اجرامِ سماوی میں کوئی اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ تمدن بھی پایا جاتا ہے۔ نیز یہ لفظ اس بات کی غمازی بھی کر رہا ہے کہ وہاں پر فوجی و عسکری قوتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی بنا پر اُوپر کی آیات میں کہا گیا ہے کہ نوعِ انسانی کی ملاقات جب اس ترقی یافتہ مخلوق سے ہوگی تو پھر انسان شکست کھا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجرامِ سماوی کے تمدن کی حالت ہماری زمین کے تمدن سے زیادہ ترقی یافتہ ہے، جس کی بنا پر ایک نہ ایک دن بنی آدم کا حُلیہ بگڑ جائے گا اور موجودہ خلائی پروازوں کی روشنی میں یہ داستان ایک حقیقت بنتی نظر آرہی ہے۔

مفسّرین کی تصریحات

واضح رہے کہ سورۂ شوریٰ کی مذکورہ بالا صراحت کی بِنا پر مفسرین کی ایک بڑی جماعت اجرامِ سماوی میں مختلف قسم کے جانداروں کے وجود کی قائل رہی ہے، حالانکہ ان کے دَور میں کوئی سائنسی تصوّر، یا اس کا امکان بھی موجود نہ تھا۔ چنانچہ زمخشریؒ، ابنِ کثیرؒ، ابوحیانؒ، امام رازیؒ اور علامہ آلوسی بغدادیؒ وغیرہ ائمہ تفسیر نے اپنی تفسیروں میں پوری صراحت کے ساتھ دوسرے سیاروں میں مختلف قسم کی مخلوقات کا امکان تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ اس موقع پر چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

امام رازیؒ (المتوفی ۶۰۶ھ) تحریر فرماتے ہیں :-

لَا يَبْعُدُ أَنْ يُقَالَ إِنَّهُ تَعَالَى خَلَقَ فِي السَّمٰوٰتِ أَنْوَاعًا مِنَ الْحَيَوَانَاتِ يَمْشُوْنَ مَشْيَ الْأَنَاسِيِّ عَلَى الْأَرْضِ : یہ بات بعید نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں (آسمانی سیاروں) میں قسم ہا قسم کے حیوانات پیدا کر رکھے ہوں، جو بالکل اسی طرح چلتے پھرتے ہوں، جس طرح کہ انسان زمین پر چلتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

ابن کثیرؒ (المتوفی ۷۷۴ھ) تحریر فرماتے ہیں :-

وَهٰذَا يَشْمَلُ الْمَلٰئِكَةَ وَالْإِنْسَ وَالْجِنَّ وَسَائِرَ الْحَيَوَانَاتِ عَلَى اخْتِلَافِ أَشْكَالِهِمْ وَأَلْوَانِهِمْ وَطِبَاعِهِمْ وَأَجْنَاسِهِمْ وَأَنْوَاعِهِمْ وَقَدْ فَرَّقَهُمْ فِي أَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ : اور اس لفظ کی وسعت میں فرشتے، انسان اور جن تمام شامل ہو جاتے ہیں، جن کی شکلوں، صورتوں، رنگوں، طبیعتوں اور اجناس و انواع وغیرہ تمام مظاہر میں اختلافات پائے جاتے ہیں، جن کو اللہ نے زمین اور آسمانوں کے مختلف مقامات پر پھیلا رکھا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور علامہ شہاب الدین آلوسی بغدادیؒ (المتوفی ۱۲۹۱ھ) تحریر فرماتے ہیں :-

لَا يَبْعُدُ أَنْ يَكُوْنَ فِي كُلِّ سَمَاءٍ حَيَوَانَاتٌ وَمَخْلُوْقَاتٌ عَلَى قَدْرٍ شَتّٰى وَأَحْوَالٍ مُخْتَلِفَةٍ لَا نَعْلَمُهَا : یہ بات بعید نہیں ہے کہ ہر آسمان میں طرح طرح کے حیوانات پھیلے ہوئے ہوں، جن کا (صحیح) علم ہمیں حاصل نہیں ہے۔ (روح المعانی)

اجرامِ سماوی میں نظامِ شریعت

غرض اجرام سماوی میں نہ صرف عاقل و صاحب شعور ہستیوں کا وجود ہے، بلکہ حسب ذیل آیات سے اس حقیقت کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے کہ وہاں پر خدائی دستور العمل کے مطابق نظام شریعت بھی اسی طرح جاری و ساری ہے جس طرح کہ ہماری زمین پر۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ

بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ : زمینوں اور آسمانوں میں جو کوئی بھی ہے (سب کے سب) خوشگواری[1] یا ناگواری کے ساتھ صبح شام اللہ ہی کے آگے سجدہ ریز ہیں اور ان کے سائے بھی سربسجود ہیں۔ (رعد: ۱۵)

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَھُمْ دٰخِرُوْنَ ۔ وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّۃٍ وَّ الْمَلٰٓئِکَۃُ وَھُمْ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ : کیا ان لوگوں کو علم نہیں ہے کہ تمام مخلوقاتِ الٰہی کے سائے اللہ ہی کے آگے سجدہ ریز ہو کر دائیں بائیں جھکے ہوئے ہیں، درحالیکہ وہ سب کے سب ذلیل و عاجز ہیں؟ اور اللہ ہی کے آگے جبینِ نیاز جھکائے ہوئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے یعنی (کُل) جاندار اور ملائکہ جو (باغی انسانوں کی طرح) تکبّر نہیں کرتے۔ (نحل: ۴۸-۴۹)

یہ آیات تکوینی و تشریعی دونوں قسم کے احکام و اوامر پر مشتمل ہیں۔ یعنی ہر جہان میں مظاہرِ کائنات اللہ کی عبادت و بندگی تکوینی (NATURAL) اعتبار سے بھی کر رہے ہیں اور تشریعی (MORAL) اعتبار سے بھی۔ نیز یہاں پر خصوصیت کے ساتھ "دابّہ" اور ملائکہ کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ اور زیرِ تحقیق کے مطابق ملائکہ کا اصل مقام سماوات (وہ کائناتِ لاہوتی جو سمائے دُنیا یا "سقفِ محفوظ"[2] سے پرے واقع ہے) ہے، اور "دابّہ" زمین اور سماوات (وہ اجرامِ ناسوتی جو "سقفِ محفوظ" کے اندر واقع ہیں) دونوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے اُن تمام جہانوں میں جہاں پر ترقی یافتہ اور متمدن "دابہ" کا وجود ہو، وہاں پر نظامِ شریعت بھی جاری ہوگا۔ اور حسبِ ذیل آیت بھی اس سلسلے میں ایک واضح منشور کی حیثیت رکھتی ہے:-

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ : کیا تجھے علم نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کوئی بھی ہیں سب کے سب (اپنی زبانِ حال اور زبانِ قال دونوں طریقوں سے) اللہ ہی کی تسبیح بیان

---

[1] خوشگواری کا صاف مطلب ہے تشریعی اعتبار سے اور ناگواری کا مطلب ہے تکوینی لحاظ سے۔

[2] "سقفِ محفوظ" کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو میری کتاب "چاند کی تسخیر قرآن کی نظر میں"۔

کر رہے ہیں ؟ اور پرندے بھی پر پھیلائے ہوئے ۔ ان میں سے ہر ایک اپنی نماز اور تسبیح کے طریقے خوب جانتا ہے ۔ (نور : ۴۱)

خلاصہ یہ کہ دابہ اور ملائکہ دو الگ الگ جنسیں (GENERA) ہیں ، جن میں کوئی جبلی مماثلت نہیں ہو سکتی ۔ بالفاظِ دیگر اصولی اعتبار سے دابہ (چلنے پھرنے اور رینگنے والی) ایک ناسوتی مخلوق ہے اور ملائکہ (پروں والی) ایک لاہوتی مخلوق ۔ ایک کی سرشت خاکی و ناری ہے تو دوسری کی نوری ۔ بہرحال اس سے پچھلی بحث کی بھی تائید ہوتی ہے کہ سماوات (عالم ناسوت) میں عقل و شعور کی قوتوں سے آراستہ کوئی ترقی یافتہ مخلوق (دابہ) بھی ضرور موجود ہے ، کیونکہ بغیر عقل و شعور کے احکام شریعت کا جاری و نافذ ہونا ایک لغو و مہمل بات ہے ، یا دوسرے لفظوں میں تشریع اور عقل و شعور دونوں لازم و ملزوم ہیں اور خدائے تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ وہ کسی مقام پر بیکار و بلا مقصد " تخلیق کا کاروبار " کرنے لگے ۔ جیسا کہ حسب ذیل نصوص سے ربانی منشا اور بنیادی اصول عیاں ہو رہا ہے ۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ ○ : تو کیا تم نے یہ خیال جما لیا ہے کہ ہم نے تم کو بیکار پیدا کر دیا ہے اور یہ کہ تم ہماری بارگاہ میں لوٹائے نہیں جا رہے ہو ؟ پس برتر ہے اللہ (ان تمام خرافات سے) جو (تمام مخلوقات کا) حقیقی مالک و بادشاہ ہے ۔ (لہٰذا) اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ (نرالے افعال والا اس کائنات میں) موجود نہیں ہے ، اور وہی عرشِ مکرم کا بھی رب ہے ۔ (مومنون : ۱۱۵ - ۱۱۶)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَ الْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۔ لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ : اور ہم نے ارض و سما اور ان دونوں کے درمیانی مظاہر کو کھیل کود میں نہیں پیدا کیا ہے ۔ اگر ہمارا ارادہ

کھیل کود کا ہوتا تو ہم اس کو خاص اپنے ہی پاس (عالمِ لاہوت میں) اختیار کر لیتے اور ہم کو عالمِ ناسوت میں خلق و آفرینش کا بازار گرم کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی)۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم (اس سلسلۂ تخلیق میں) حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں جو اس کا بھیجہ پھاڑ دیتا ہے۔ تو وہ (باطل) نابود ہو جاتا ہے، اور تمہاری خرابی ہے جو تم (مقصدِ آفرینش کے بارے میں طرح طرح کے گمراہ کن) بیانات دے رہے ہو۔ (انبیاء: ۱۶-۱۸)

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ : زمین، آسمانوں اور ان دونوں کے درمیانی مظاہر پر اللہ ہی کی حکمرانی ہے۔ وہ (جس جہاں میں) جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، (اس کو کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے) اور اس کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔ (مائدہ: ۱۷)

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ . اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِيْمُ : اور ہم نے زمین و آسمانوں اور ان کے مابین کی چیزوں کو بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے اور یقیناً وقتِ موعود (قیامت) آنے والا ہے۔ لہٰذا تم (منکرین کی باتوں اور ان کے طعنوں پر) بہتر طریقے سے درگذر کرتے رہو۔ بلاشبہ تمہارا رب بڑا خلاق (مخلوقات کو یکے بعد دیگرے پیدا کرنے والا) اور بڑا ہمہ دان ہے۔ (حجر: ۸۵-۸۶)

قرآنِ حکیم کے یہ تمام بیانات حد درجہ بلیغ اور اپنے معانی و مطالب اور اغراض و مقاصد میں بالکل واضح ہیں اور کہیں بھی کوئی پیچیدگی نظر نہیں آتی۔ اور یہی اس کتابِ حکمت کا کمال اور سب سے بڑا اعجاز ہے کہ اس کو جس سیاق و سباق میں دیکھا جائے معانی و مطالب کی ایک نئی دنیا دکھائی دیتی ہے۔

اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ : یقیناً ہم نے اس کو ایک واضح اور غیر پیچیدہ قرآن بنایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ (زخرف: ۳)

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ : اور ہم نے نوعِ انسان کے لئے اس قرآن

میں ہر ایک قسم کی مثال بیان کر دی ہے، تاکہ وہ چونک سکے۔ یہ فصیح و غیر پیچیدہ قرآن ہے' تاکہ لوگ (اس کے ذریعہ) اللہ سے ڈر سکیں۔ (زمر: ۲۷-۲۸)

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ : یہ ہیں وہ آیات اور حکمت بھرا تذکرہ جو ہم آپ کو پڑھ کر سنا رہے ہیں۔ (آل عمران: ۵۸)

آسمانی مخلوق کہاں ہے

"سماوات" جمع کا صیغہ ہے، جس کا اطلاق تین سے لے کر لامحدود تعداد پر ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث آسمانی مخلوق بے شمار اجرام میں پھیلی ہوئی ہوگی، مگر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مخلوق آیا ہمارے نظامِ شمسی کے کسی سیارے میں بھی موجود ہے یا نہیں! اس بارے میں تین قسم کے امکانات ہیں:-

(۱) ہو سکتا ہے کہ زہرہ یا مریخ پر زندگی کے ابتدائی مظاہر و آثار پائے جائیں۔

(۲) یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں کے سرد یا گرم ماحول کو برداشت کرنے والی کوئی ترقی یافتہ مخلوق بھی پائی جائے۔

(۳) اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں پر سرے سے زندگی ہی مفقود ہو۔

قرآنی نقطۂ نظر سے اس قسم کی تصریح ایک غیر ضروری چیز ہے، جس میں ایک بہت بڑی مصلحت کار فرما ہے۔ اور دوسری حیثیت سے قرآن فلکیات کی کوئی کتاب نہیں ہے، جس میں اس سلسلے کی ایک ایک تفصیل بیان کر دی جائے۔ بہرحال انسان کی عبرت و بصیرت کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ اجرامِ سماوی میں ایک ترقی یافتہ مخلوق کا وجود ہے اور ضرور ہے۔ مگر یہ بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی کہ یہ ترقی یافتہ مخلوق کونسے نظامِ شمسی میں موجود ہوگی؟ آیا ہمارے ہی نظامِ شمسی میں یا "شعرائے یمانی" یا "کلب جوزا" (SIRIUS) میں؟ - الف قنطورس میں یا دائی سگنائی (Y CYGNI) میں[1]۔ مگر وہ جہاں بھی ہو اس کا وجود ہے اور ضرور ہے۔ اور ایک نہ ایک دن انسان

---

[1] یہ تمام قریبی ستارے ہیں جو ہماری کہکشاں میں واقع ہیں۔

کی اس سے مڈبھیڑ ہو جانا بھی کچھ بعید نہیں ہے ۔

اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہیئے کہ قرآن حکیم میں جہاں کہیں بھی "ارض و سماوات" کا تذکرہ آیا ہے ہر جگہ ارض پر سماوات کو مقدم رکھا گیا ہے ۔ اس میں شاید یہ اشارہ بھی ہو کہ ہماری زمین کے مقابلے میں اجرام سماوی کی تخلیق پہلے ہوئی ہے ۔ لہٰذا وہاں کی تہذیب و تمدن بھی زیادہ قدیم اور ترقی یافتہ ہے ۔

کیا جِنّ آسمانی مخلوق ہیں ؟

قرآن مجید ایک حیرت انگیز اور انقلابی نظریات کی حامل کتاب ہے ، جس میں ہر چیز کی تفصیل موجود ہے ۔ چنانچہ وہ پوری صراحت کے ساتھ (بغیر کسی پیچیدگی کے) اعلان کر رہا ہے کہ دیگر اجرام سماوی میں جو مخلوق (دابّہ) موجود ہے وہی جن ہے ۔ ملاحظہ ہو :-

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطَانٍ : اے گروہِ جن و انس اگر تم آسمانوں اور زمین کے کناروں سے نکل جانے کی طاقت ہو تو نکل جاؤ ۔ (مگر) تم بغیر زور آزمائی (انتہائی طاقت کے) نکل نہیں سکتے ۔ (رحمان : ۳۳)

اس آیتِ کریمہ میں خطاب جنوں اور انسانوں سے ہے ۔ پھر ترتیب میں جنوں کو انسانوں پر مقدم رکھا گیا ہے ۔ پھر اس کے بعد " سماوات " اور " ارض " کے الفاظ لائے گئے ہیں ۔ چنانچہ یہاں بھی آسمانوں کو زمین پر مقدم رکھا گیا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جِنّ سماوات میں اور انسان زمین میں آباد ہیں ۔ علم بدیع کی اصطلاح میں اس ترتیب کو " لف و نشر مرتب " کہا جاتا ہے ۔

بہرحال اگر یہ مطلب نہ لیا جائے تو یہاں پر آسمانوں کا ذکر ہی بے معنی ، اور فضول نظر آئے گا ۔ ظاہر ہے کہ جب جن و انس زمین پر ہی آباد ہوں گے تو پھر آسمانوں کے کناروں سے نکل جانے کا حکم بے معنی ہو جائے گا ۔ یہ بات تو اُسی وقت کہی جا سکتی ہے ، جبکہ آسمانوں میں بھی آبادی کا وجود پایا جائے ۔ یہ ظاہر ہے کہ قرآن ایک حکیمانہ کلام ہے ۔ واضح رہے کہ یہاں پر آسمانوں سے مُراد مختلف اجرام سماوی ہیں

سورۂ رحمان کی اس آیتِ کریمہ میں انسانوں کے ساتھ جنات کو بھی مخاطب کرنا اس بات کا صاف صاف اعلان ہے کہ موجودہ "خلائی عہد" سے بھی جنات کا بہت گہرا تعلق ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خطاب خواہ مخواہ اور بلا مقصد نہیں ہو سکتا۔ تفصیل کی اس موقع پر گنجائش نہیں۔

بہرحال جب یہ ثابت ہو گیا کہ دیگر اجرام سماوی میں جو مخلوق آباد ہے وہی جن ہے تو قرآن حکیم کے دیگر نصوص سے اس موضوع پر مزید روشنی پڑتی ہے اور اس عجیب و غریب مخلوق کی مزید تفصیلات سامنے آتی ہیں۔

تین الفاظ

قرآن حکیم میں جنوں کے لئے تین قسم کے الفاظ لائے گئے ہیں جو ایک ہی مادہ سے تعلق رکھتے ہیں: (۱) جَآنّ: یہ لفظ سات بار آیا ہے۔ (۲) جِنّ: یہ لفظ بائیس مرتبہ آیا ہے۔ (۳) جِنّہ یہ لفظ جنّ کے معنی میں پانچ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ یہاں پر اُن تمام آیات کا استقصاء مقصود نہیں ہے بلکہ یہ موضوع ایک مستقل مقالے کا طالب ہے۔ لہٰذا یہاں پر صرف چند متعلقہ آیات پیش کی جاتی ہیں۔

جنات کا معاشرہ

سب سے پہلی حقیقت جو سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ انسانوں ہی کی طرح جنات کا بھی ایک باقاعدہ معاشرہ موجود ہے، جیسا کہ سورۂ رحمان کی اُوپر والی آیت میں یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ کے الفاظ سے ظاہر ہو رہا ہے۔ اس میں لفظ "معشر" جو معاشرہ کے معنی میں ہے، اسی حقیقت کا اظہار کر رہا ہے۔ اس سے پچھلے ابواب کی بھی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ وہاں پر ابہام تھا، یہاں پر تفصیل ہے۔

جنّات مکلّف ہیں

انسانوں کی طرح آسمانی مخلوق بھی مکلف ہے، جیسا کہ متعدد آیات سے ظاہر ہوتا ہے:-

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ: جنوں اور انسانوں کو میں نے صرف اپنی

عبادت کے لئے پیدا کیا ہے ۔ (ذاریات)

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ : اور تیرے رب کی بات پوری ہوئی کہ میں جہنم کو تمام جنّوں اور انسانوں سے بھردوں گا ۔ (ہود : ۱۱۹)

آسمانی مخلوق میں انبیاء

جس طرح ہمارے کرۂ ارض میں سلسلۂ رسالت جاری رہا ہے اسی طرح دیگر اجرام سماوی میں بھی سلسلۂ رسالت جاری ہے ۔ وہاں بھی نیک و بد کی پہچان اور اچھے بُرے میں تمیز کروانے کے لئے مختلف انبیاء مبعوث ہوئے ہیں ۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا : اے گروہ جن و انس کیا تمہارے پاس تم ہی میں سے ایسے رسول (میرے بھیجے ہوئے) نہیں آئے جو تم کو میری آیات سناتے اور آج (قیامت) کے اس دن کے بارے میں تم کو متنبہ کرتے رہے ؟ (انعام : ۱۳۱)

عقل و شعور کا مظاہرہ

قرآن حکیم اس حقیقت کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ آسمانی مخلوق میں بھی دلیل و استدلال کا بازار گرم ہے اور یہ بات بغیر عقل و شعور کے ممکن نہیں ۔

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ :

اور ہم نے دوزخ کے لئے بہت سے جنّوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے، جن کے دل تو ہیں مگر ان سے سمجھتے نہیں، ان کی آنکھیں تو ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں ۔ اور ان کے کان تو ہیں مگر ان سے سنتے نہیں ۔ یہ لوگ بالکل چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ۔ یہی لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں ۔ (اعراف : ۱۷۹)

اس آیتِ کریمہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طبقۂ انس کی طرح طبقۂ جن میں بھی خدائی آیات و نشانات (کائنات کے بنیادی حقائق) کو دیکھ کر خدا کی معرفت حاصل کرنے کا سلسلہ برابر جاری ہے ۔

حرفِ آخر

امام بیہقیؒ نے کتاب الاسماء والصفات" میں حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ سات

زمینوں میں سے ہر زمین میں ایک نبی ہے تمہارے نبی کی طرح، اور آدم ہے (تمہارے) آدم کی طرح، اور نوح ہے (تمہارے) نوح کی طرح، اور ابراہیم ہے (تمہارے) ابراہیم کی طرح، اور عیسیٰ ہے (تمہارے) عیسیٰ کی طرح۔
(ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر، ج ۴ ص ۳۸۵)

یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ دیگر اجرامِ سماوی میں بھی نظامِ شریعت اسی طرح قائم ہے، جس طرح ہماری زمین پر۔ مذکورۂ بالا روایت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ موجود نہیں ہے تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غالباً خاتم النبیین صلعم تمام اجرامِ سماوی کے لئے متحد ہے اور غالباً اسی وجہ سے معراج کے موقع پر تمام انبیائے کرام کو اکٹھا کیا گیا تھا، تاکہ اب ختمِ نبوت کا اعلان کر دیا جائے۔ اور غالباً اسی وجہ سے قرآنِ عظیم کو بھی دیگر اجرامِ سماوی (سات زمینی سلسلوں میں) بھیجنا ناضروری سمجھا گیا۔

واضح رہے کہ بیہقی کی مذکورۂ بالا روایت کو ابنِ جریرؒ ابنِ ابی حاتم اور حاکم وغیرہ نے بھی کچھ الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بیان کیا ہے۔ امام ذہبی نے اس کی سند کو صحیح قرار دیا ہے۔ مگر کچھ دیگر علماء نے اس کو شاذ اور موضوع قرار دیا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ قدیم دَور میں اس قسم کے تصوّرات ناقابلِ فہم نظر آتے تھے۔ چنانچہ خود ابنِ عباسؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں آیۂ کریمہ "سبع سمٰوٰت و من الارض مثلھن" کی (صحیح صحیح) تفسیر بیان کرنے لگوں تو تم اس کی تکذیب کر بیٹھو۔ (ملاحظہ ہو تفسیر ابنِ کثیر، ج ۴ ص ۳۸۵)

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ اس بارے میں بہت کچھ جانتے تھے — جو آپ نے یقیناً رسولِ اکرم صلعم سے سُنا ہوگا۔ مگر آپ نے سکوت ہی کو مناسب سمجھا کہ لوگ بے یقینی کی بنا پر جھٹلا نہ بیٹھیں — ! مگر آج جدید تحقیقات و انکشافات کی روشنی میں ان حقائق کو جھٹلانے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ تحقیقاتِ جدیدہ کا دائرہ جیسے جیسے وسیع ہوتا جا رہا ہے، ویسے ویسے قرآنی اشارات و کنایات اور اس کے ابہامات واضح اور روشن تر ہوتے جا رہے ہیں، جو قرآن حکیم کے اعجاز اور اس کی حیرت انگیز جامعیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اور اُمید ہے کہ زمانۂ مستقبل میں اس سلسلے کی مزید معلومات و تفصیلات سامنے آئیں گی۔

ہماری مطبوعات
تفسیر ابن کثیرؒ
(پانچ جلدوں میں)
فاتحۃ الکتاب
(خواجہ عبدالحی فاروقی، محمد عبدہ)
قرآن پاک کی مستند تفسیر، آسان اور عام فہم زبان میں
مناظرِ قیامت
(قرآن کی زبان میں)
غنیۃ الطالبین
عربی اردو
عرب کا چاند
سوامی لکشمن پرشاد
ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
خواجہ حامد نظامی
تذکرۃ الانبیاء علیہ السلام
مولانا ناصر علی خان
اسلام اور جدید ریاستی نظام
ڈاکٹر محمد سرور
قائداعظم نے کیا کہا؟
پروفیسر شریف بقا
ایران و پاکستان کے حوالے سے ایک بلند پایہ تالیف
عثمانی ترکوں کی تاریخ
شاہنامہ اسلام
افکارِ اقبالؒ
علامہ اقبال
مکتبہ تعمیرِ انسانیت، اردو بازار
500
1156